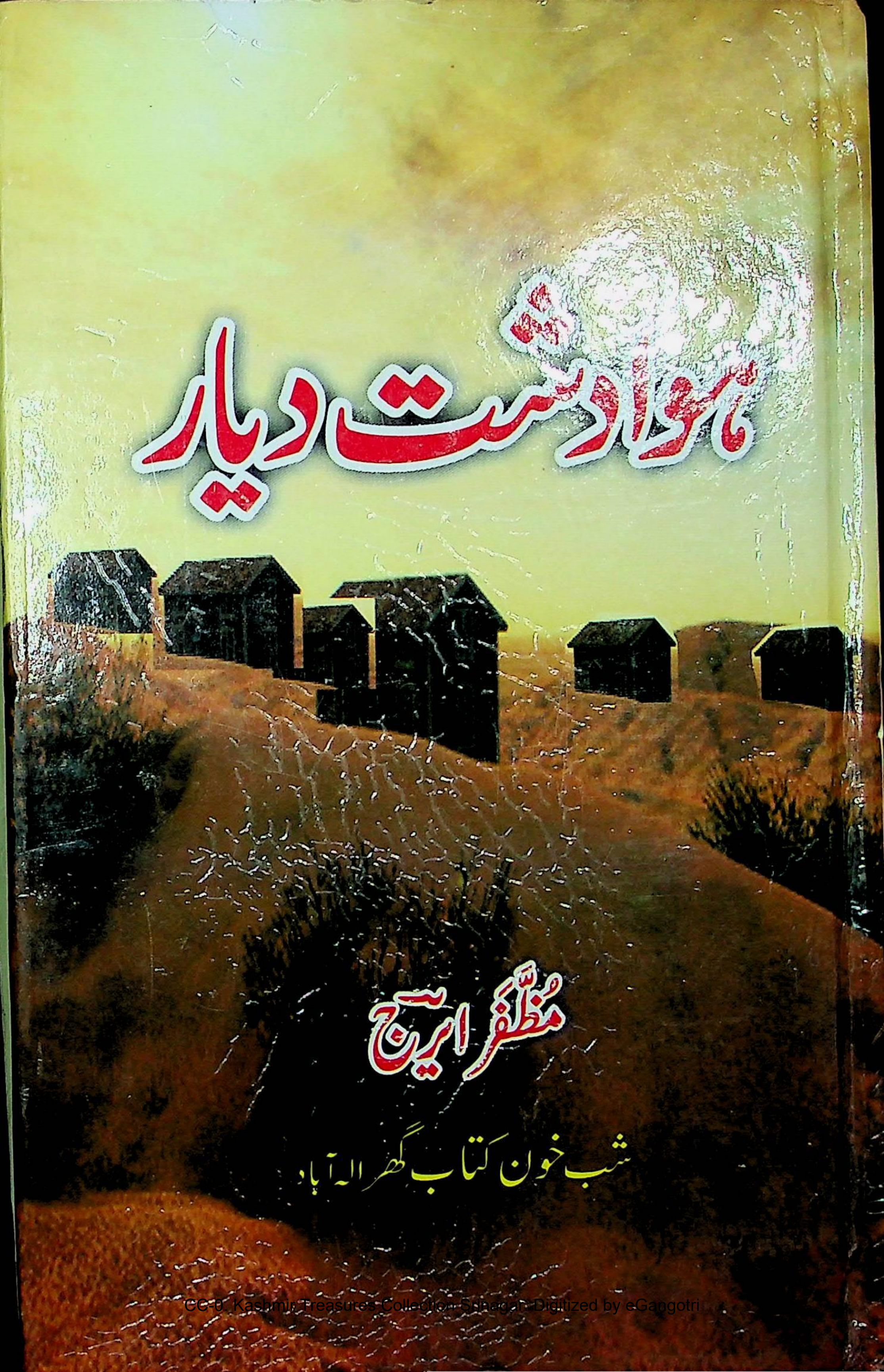


ہوا دشت دیار
مظفرؔ ایرج
شب خون کتاب گھر الہ آباد

ابھرتے ہوئے کالم نگار، خاکہ نویس
اور نقاد عزیزم سلیم ساگر کے لیے
ڈھیر ساری تمناؤں کے ساتھ

۲۴/۱/۱۰

ہوا دشت دیار

ہزاراں سال با فطرت نشستم
بہ اُو پیوستم و از خود گستم
ولیکن سرگذشتم ایں دو حرف است
تراشیدم ، پرستیدم ، شکستم

اقبالؒ

هوا دشت دیار

مُظّفر ایرجؔ

شب خون کتاب گھر الہٰ آباد۔۳

نام کتاب: ہوادشت دیار (شعری مجموعہ)

شاعر: محمد مظفر نقشبندی

قلمی نام: مُظّفر ایرجؔ

پتہ: ''کہکشاں'' نوگام (بائی پاس) سرینگر ۱۹۰۰۱۵ کشمیر

موبائیل: 9906679723 /9018153797

دیگر شعری مجموعے: ابجد 1983، انکسار 1988، ثبات 2007، دل کتاب 2009

انتخاب و ترتیب: ڈاکٹر اشرف آثاری

اہتمام: جاوید انور (تحریک ادب بنارس)

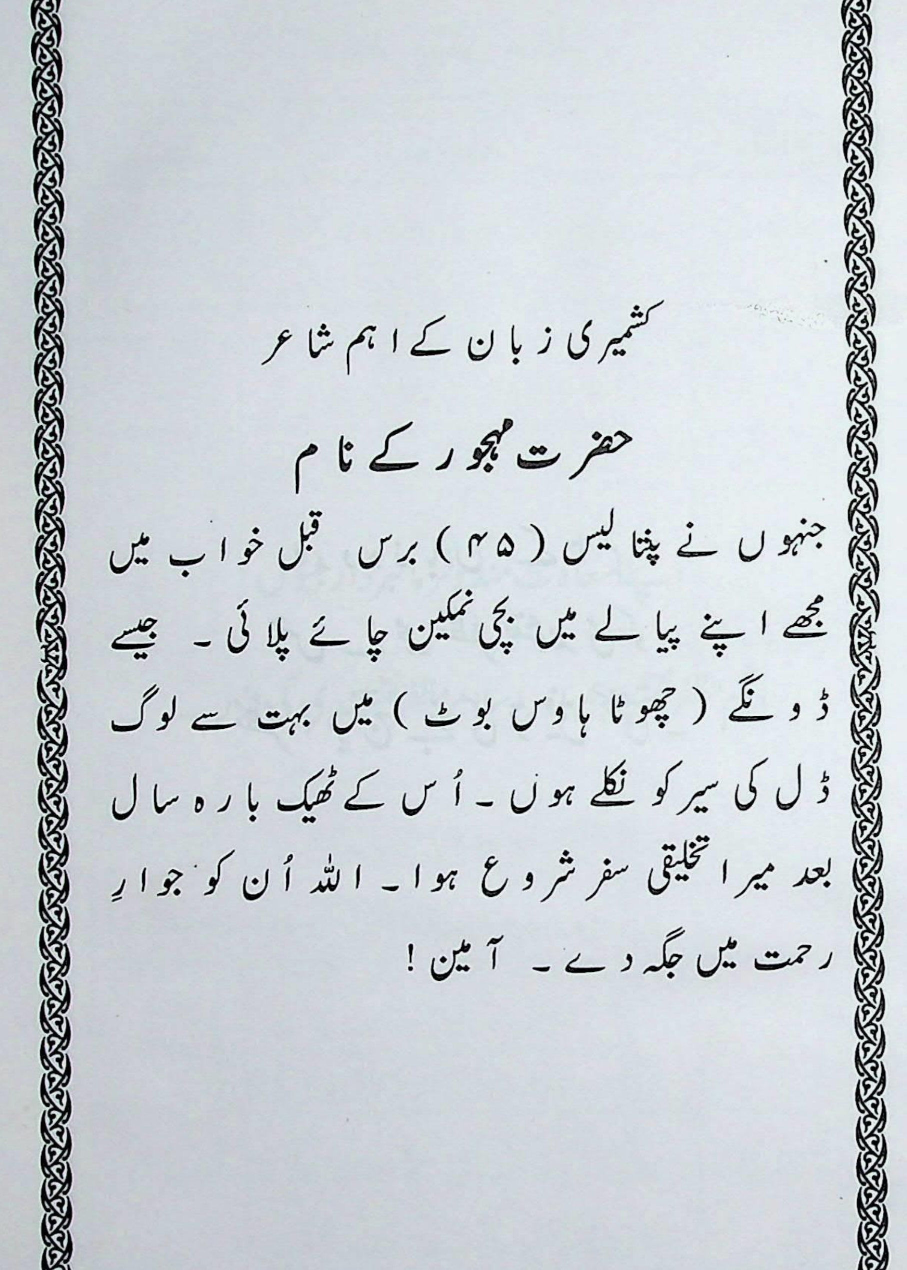
سال اشاعت: دو ہزار نو (۲۰۰۹)

تعداد: پانچ سو

کمپوزنگ / سرورق: شکیل سائیبر ورلڈ (چھانہ پورہ)

قیمت: چار سو پچاس روپے

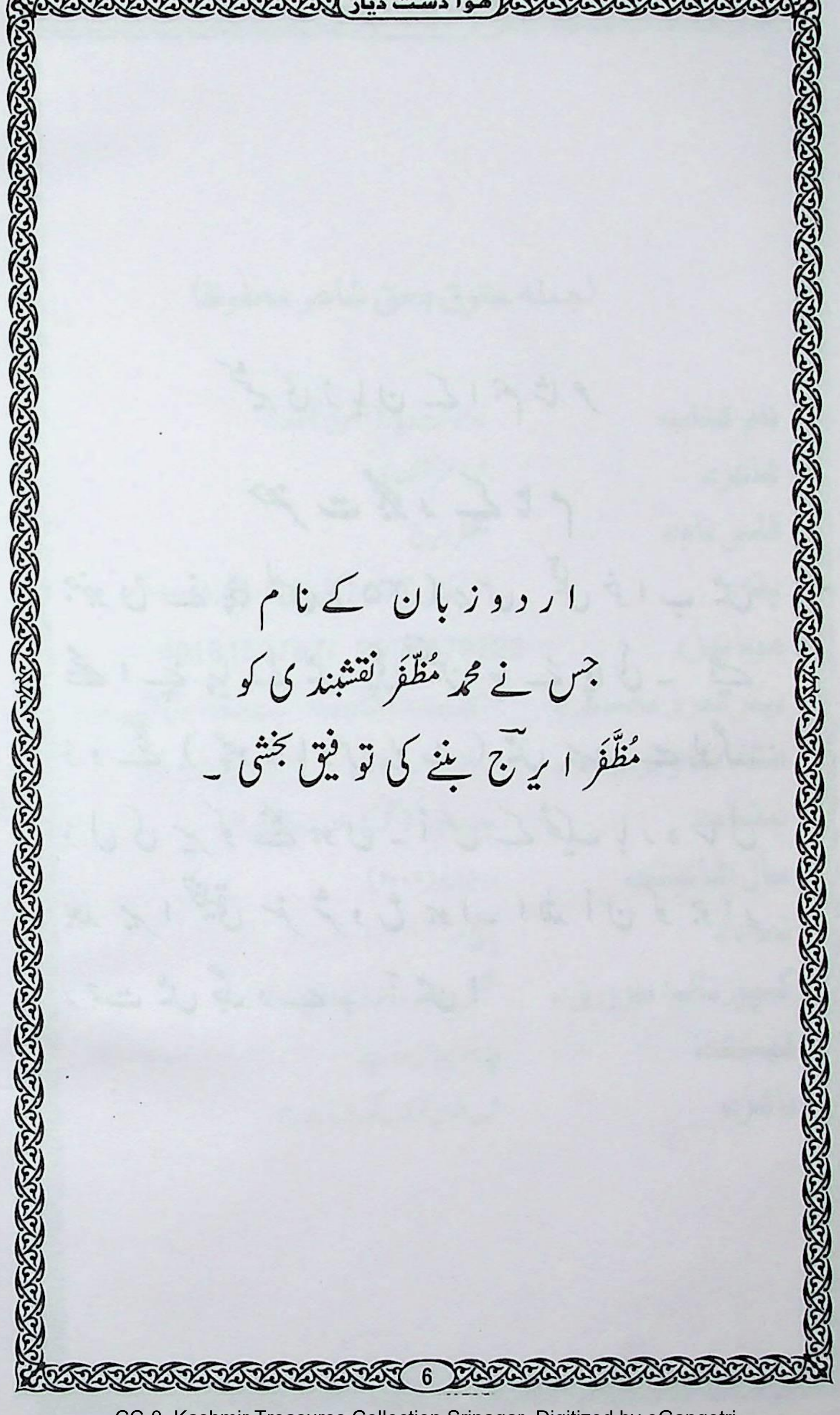
ناشر: شب خون کتاب گھر الہ آباد۔۳



کشمیری زبان کے اہم شاعر

حضرت مہجور کے نام

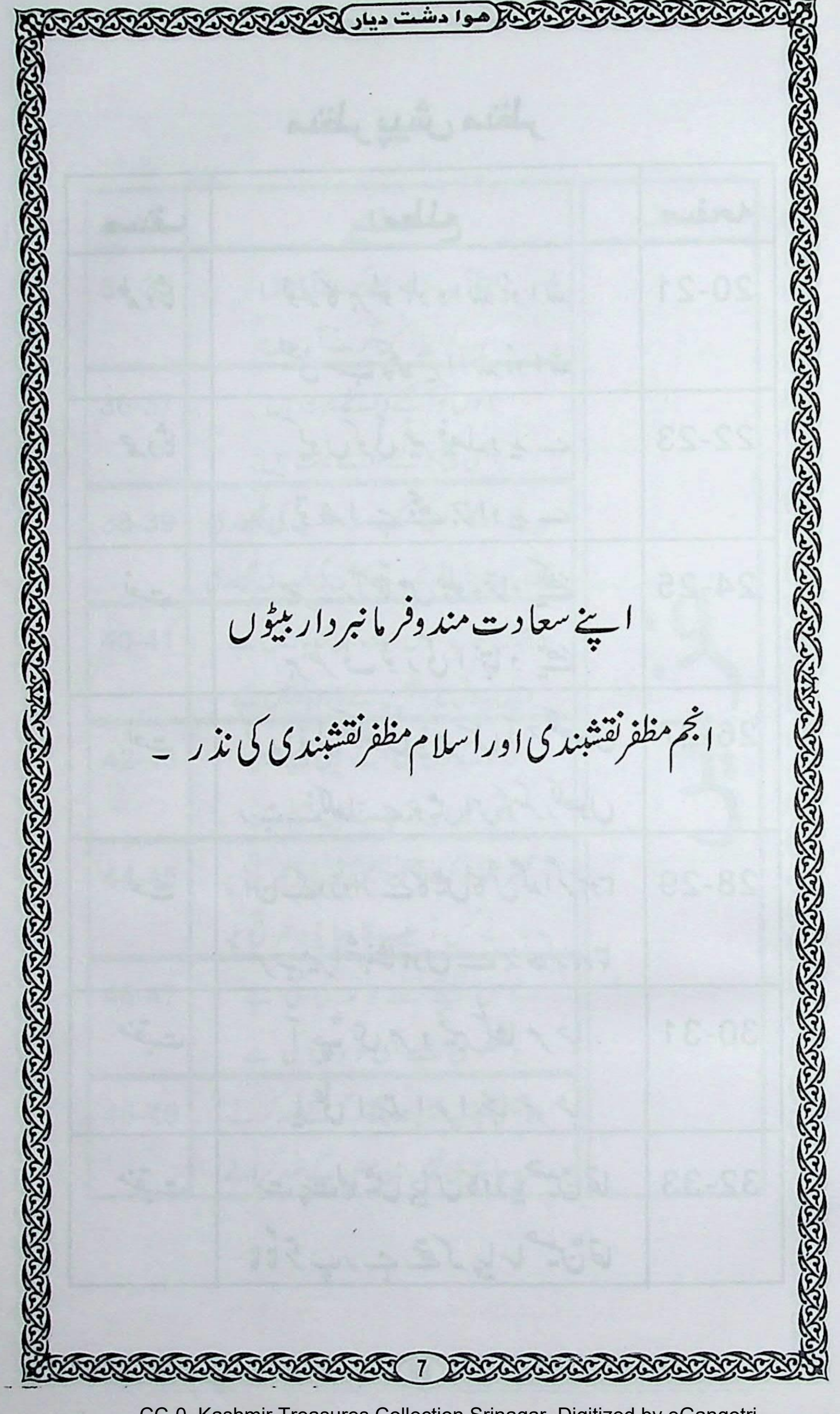
جنہوں نے پنتالیس (۴۵) برس قبل خواب میں مجھے اپنے پیالے میں بچی نمکین چائے پلائی۔ جیسے ڈونگے (چھوٹا ہاوس بوٹ) میں بہت سے لوگ ڈل کی سیر کو نکلے ہوں۔ اُس کے ٹھیک بارہ سال بعد میرا تخلیقی سفر شروع ہوا۔ اللہ اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!



ا ر د و ز با ن کے نا م

جس نے محمد مُظفر نقشبند ی کو

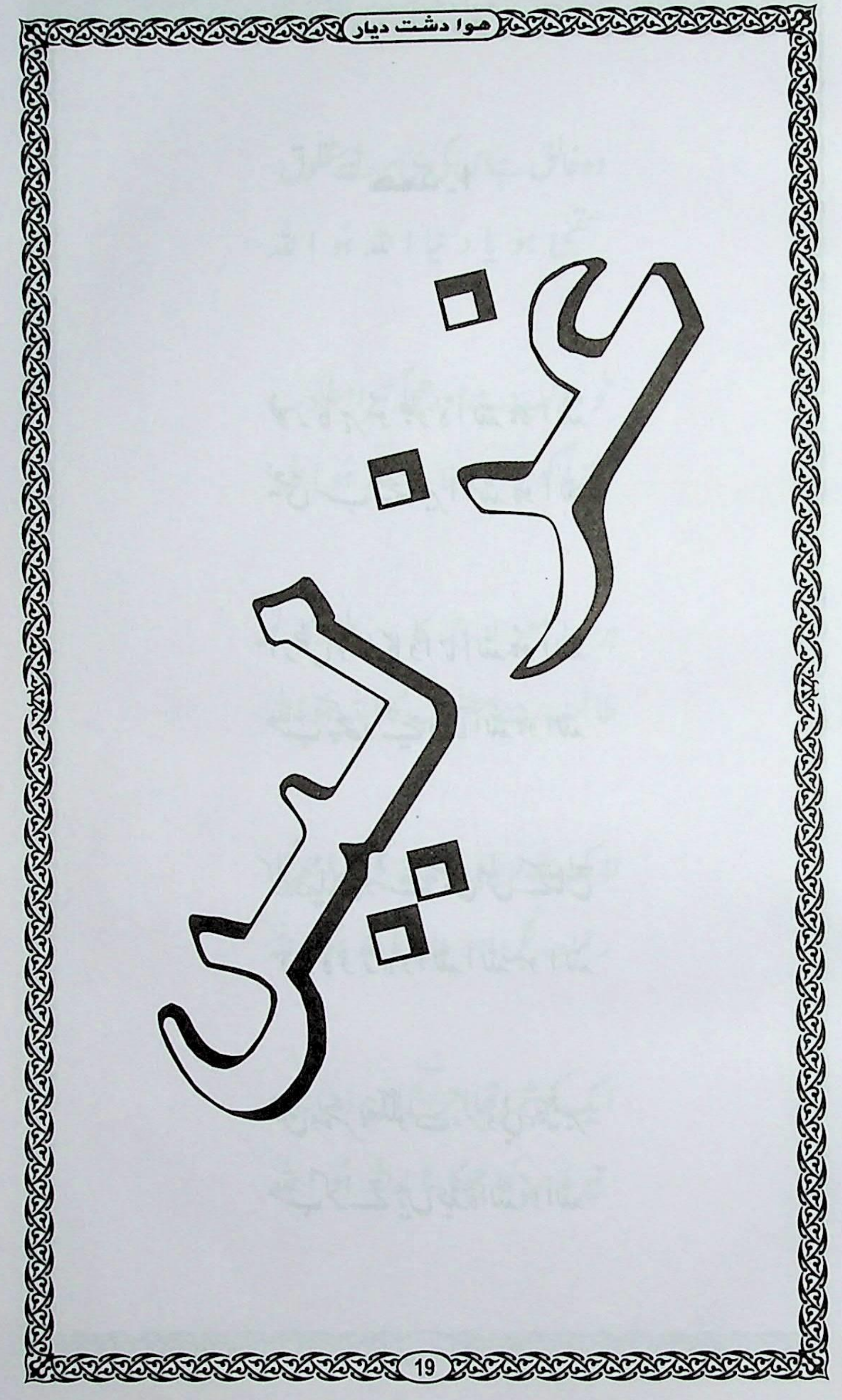
مُظَفّر ا یرؔج بننے کی تو فیق بخشی ۔



اپنے سعادت مند و فرمانبردار بیٹوں

انجم مظفر نقشبندی اور اسلام مظفر نقشبندی کی نذر ۔

منظر پیش منظر



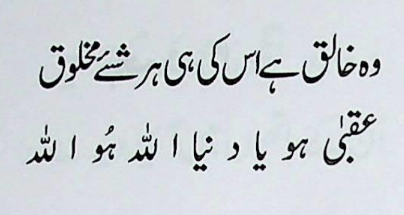
حمد۔۱

نور کا ہر سُو جلوہ اللہ ہُو اللہ
یعنی سب کچھ تیرا اللہ ہُو اللہ

ارض وسما کا داتا اللہ ہُو اللہ
سب کچھ دینے والا اللہ ہُو اللہ

کوہ و بیاباں دشت و جبل اس کے تابع
ذرہ ذرہ واللہ اللہ ہُو اللہ

جن و بشر، مَلکُوت، کروبی، پیغمبر
سب کرتے ہیں سجدہ اللہ ہُو اللہ



وہ خالق ہے اس کی ہی ہر شئے مخلوق
عقبیٰ ہو یا دنیا اللہ ہو اللہ

تُو طالب ہے اور طحہٰؐ تیرا مطلوب
اُس ﷺ کو پاس بلا یا اللہ ہو اللہ

ہر لمحہ معراج کا ، ملنے کا لمحہ
طالب سے مطلوب کا اللہ ہو اللہ

لاکھ سے زیادہ آئے نبیؑ پر احمد ﷺ کا
رحمتِ کُل ہو جانا اللہ ہو اللہ

ایک کرشمہ تھا ایرجؔ اس دُنیا میں
تیرا سر کو جھکانا اللہ ہو اللہ



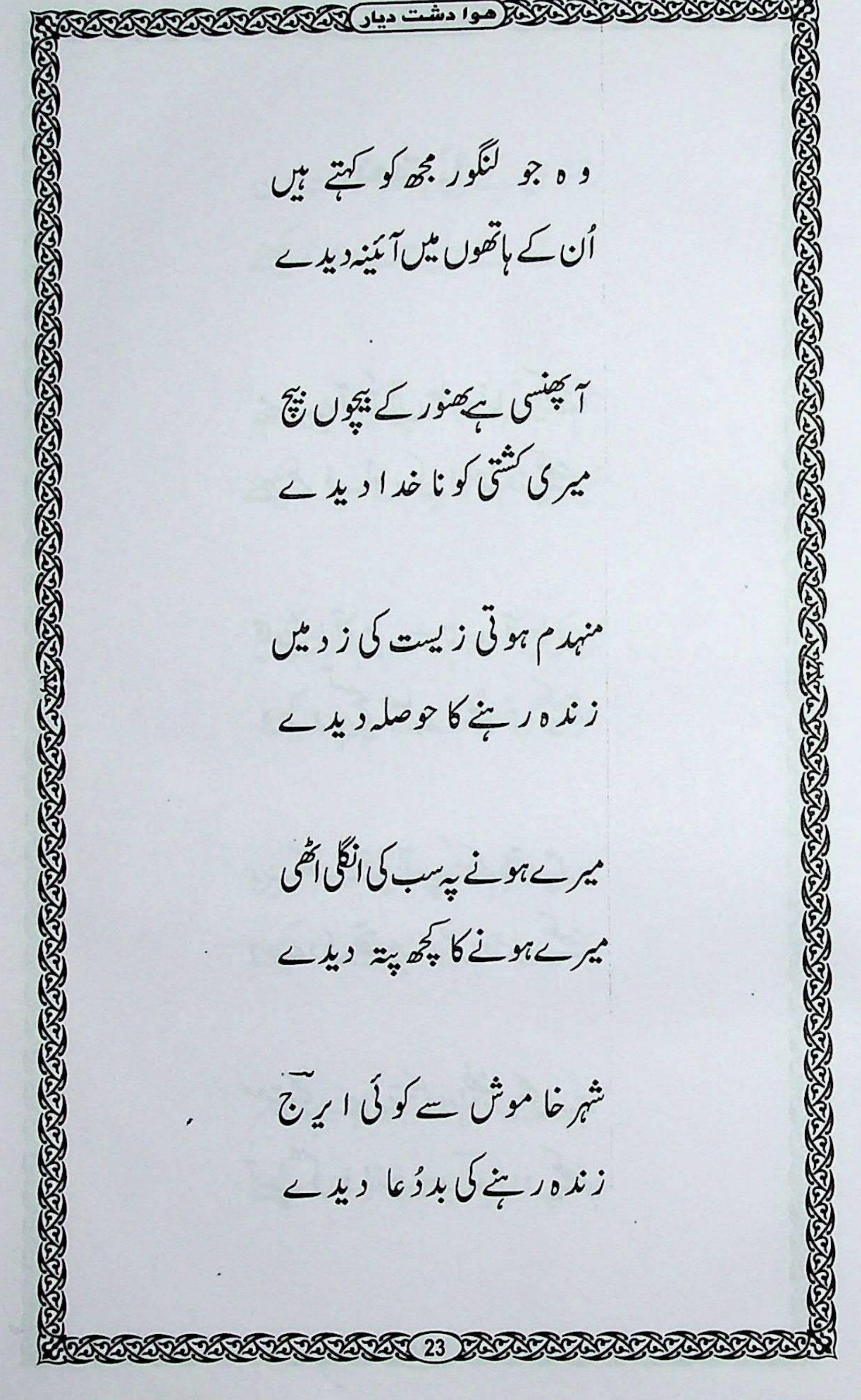
حمد ۔ ۲

کیوں کوئی غیر فیصلہ دیدے
تو خدا ہے مجھے جزا دیدے

گھر کی پردیس میں فضا دیدے
دشتِ غربت میں آسرا دیدے

آگے دریا ہے اور پیچھے غنیم
مجھکو پانی میں راستہ دیدے

بات میں ربط، لفظ میں تاثیر
گفتگو میں بھی کچھ نیا دیدے



وہ جو لنگور مجھ کو کہتے ہیں
اُن کے ہاتھوں میں آئینہ دیدے

آ پھنسی ہے بھنور کے پیچوں بیچ
میری کشتی کو ناخدا دیدے

منہدم ہوتی زیست کی زد میں
زندہ رہنے کا حوصلہ دیدے

میرے ہونے پہ سب کی انگلی اٹھی
میرے ہونے کا کچھ پتہ دیدے

شہرِ خاموش سے کوئی آ ایرجؔ
زندہ رہنے کی بددُعا دیدے



نعت۔۱

میرے آقاؐ ہیں جلوہ نما دیکھئے
ہر طرف نور کی انتہا دیکھئے

قلبِ اقنوم سے تا حدِ آسماں
وردِ تسبیحِ صلِ علےٰ دیکھئے

ربِ کعبہ نے تو آپؐ کے ہاتھ میں
دے دی تقدیرِ ارض وسما دیکھئے

معتبر بھی ہے برتر بھی، افضل بھی ہے
آپؐ کی ذات بعدِ خدا دیکھئے

رحمتوں کے نبیؐ با خدا رات دن
کرتے رہتے ہیں رحمت عطا دیکھئے

ہم کو جو کچھ ملا آپؐ کی دین ہے
کیا نبیؐ ہم کو رب نے دیا دیکھئے

اُن کی چوکھٹ پہ جنت ہے گوشہ نشیں
عرش بھی اُن کے ہے زیرِ پا دیکھئے

کیوں نہ ہم دامنِ دل کشادہ کریں
آ گئے آ گئے مصطفیٰؐ دیکھئے

کب سے چشمِ عنایت کا ہے منتظر
جانبِ ایرجِ بے نوا دیکھئے

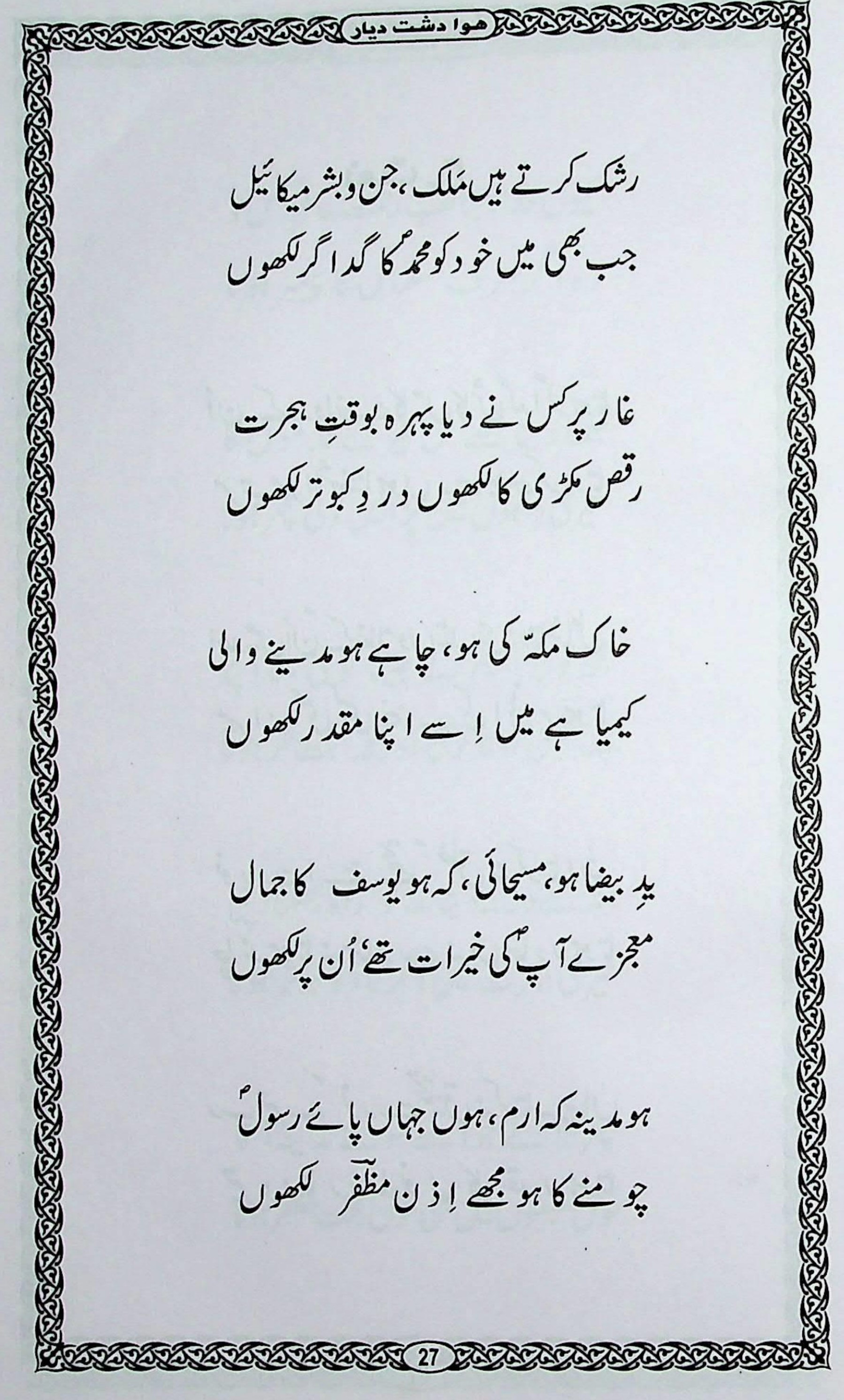
نعت۔۲

نورِ اوّل لکھوں یا مُرسلِ آخر لکھوں
رب نے لکھا ہے جو میں اس کو مکرر لکھوں

میرے دامن میں نہیں حشر کا ساماں کچھ اور
آپؐ کی نعت پہ تکیہ ہے، برابر لکھوں

جس کو جامیؒ نے لکھا الف، سرو، نخلِ مُراد
ایسے قامت کو میں قرآن کا پیکر لکھوں

انبیاء کے مجھے رہتا ہے مراتب کا خیال
آپؐ کو سب میں مگر افضل و برتر لکھوں



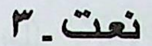
رشک کرتے ہیں مَلک ، جن و بشر میکائیل
جب بھی میں خود کو محمدؐ کا گداگر لکھوں

غار پر کس نے دیا پہرہ بوقتِ ہجرت
رقص مکڑی کا لکھوں دردِ کبوتر لکھوں

خاک مکہّ کی ہو، چاہے ہو مدینے والی
کیمیا ہے میں اِسے اپنا مقدر لکھوں

یدِ بیضا ہو، مسیحائی، کہ ہو یوسف کا جمال
معجزے آپؐ کی خیرات تھے، اُن پر لکھوں

ہو مدینہ کہ ارم، ہوں جہاں پائے رسولؐ
چومنے کا ہو مجھے اِذن مظفّر لکھوں



نعت ۔ ۳

اُن کے دروازے کا میں کاش گداگر ہوتا
مرتبہ میرا شہنشاہوں سے بڑھ کر ہوتا

احد میں اُنؐ کے غلاموں میں ہی ہوتا شامل
میرا سر بھی کسی نیزے کی انی پر ہوتا

نور سے اپنے تجھےؐ خلق نہ کرتا اللہ
چاند ہوتا نہ ستارے نہ ہی خاور ہوتا

رب تیرےؐ نور سے تخلیق نہ کرتا یہ جہاں
تیرہ و تار زمانوں کا مقدر ہوتا

کیوں خدا دیتا لقب رحمتِ عالمؐ اُس کو
وہؐ اگر صرف مسلماں کا پیمبر ہوتا

جگمگا دیتا مجھے لمس تیرےؐ قدموں کا
تیریؐ راہوں میں پڑا میں کوئی پتھر ہوتا

مجھ کو براہیمؑ کے جیسا کوئی ملتا اپنا
بُت شکن ہوتا کوئی اور نہ بُت گر ہوتا

انڈے دے دیتا عدُو راہ بھٹکتا اپنی
تیریؐ ہجرت میں اگر مادہ کبوتر ہوتا

پھر بُلا لے جو اُسے سوئے مدینہ آقا
خوش نصیبوں میں بھی خوش بخت مظفر ہوتا

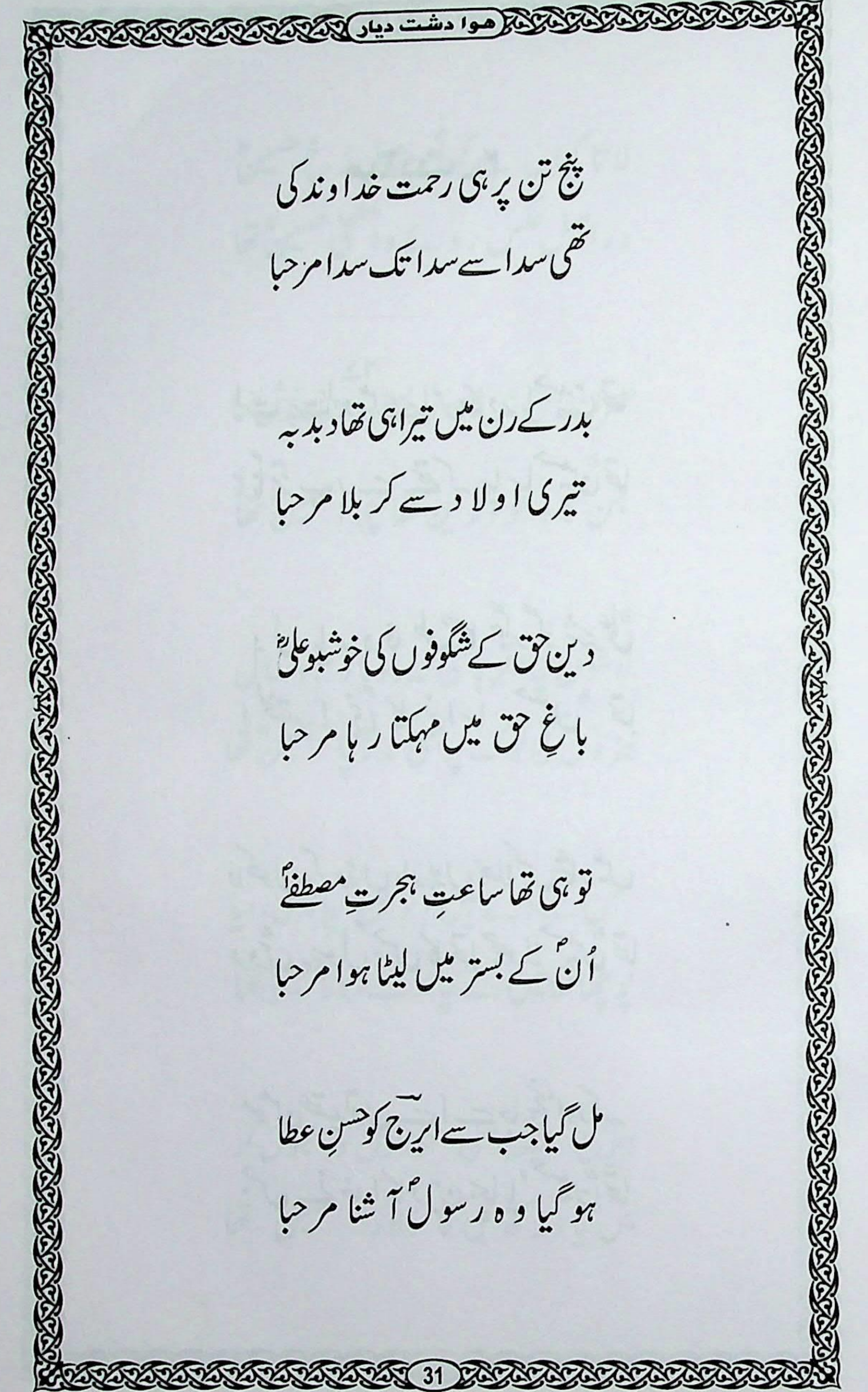
منقبت۔ ا

آپؑ ہی مردِ خیبر کُشا مرحبا
یا علی ابتداء انتہا مرحبا

تیرے زانو پہ آرام میں تھے نبیؐ
عصر کو لوٹ آنا پڑا مرحبا

وقتِ ایماں تھا سلمانؑ سب سے بڑا
سب سے کم سِن تھا شیرِ خدا مرحبا

عقد میں بخش کے تم کو نورِ نظر
مصطفیٰؐ نے کہا مرحبا مرحبا



پنج تن پر ہی رحمت خداوند کی
تھی سدا سے سدا تک سدا مرحبا

بدر کے رن میں تیرا ہی تھا دبدبہ
تیری اولاد سے کربلا مرحبا

دین حق کے شگوفوں کی خوشبو علیؓ
باغِ حق میں مہکتا رہا مرحبا

تو ہی تھا ساعتِ ہجرتِ مصطفےٰ
اُنؐ کے بستر میں لیٹا ہوا مرحبا

مل گیا جب سے ایرجؔ کو حسنِ عطا
ہو گیا وہ رسولؐ آشنا مرحبا

منقبت ۔ ۲

لت پت لہو میں پیاس کا دریا حسینؑ تھا
ناناؐ تڑپ رہے تھے کہ پیاسا حسینؓ تھا

دل پارہ فاطمہؓ کا جگر گوشۂ علیؓ
المختصر! نبیؐ کا نواسا حسینؓ تھا

لاکھوں، کروڑں، اربوں بھلا کس شمار میں
دوشِ رسولؐ جس کا تھا جھولا حسینؓ تھا

مومن عقیدتوں سے اُسے جانچ، اور کہہ
جس نے خدا کا دین بچایا، حسینؓ تھا

لاتا کہاں سے کوئی مثالِ رُخِ حسینؓ
دراصل عکسِ روئے والضحیٰ حسینؓ تھا

صحرائے حق میں پھول بہتر[72] تھے خوش نما
جن کا وجود دین تھا چہرا حسینؓ تھا

لاشوں پہ اقربا کی نہ رویا دمِ وصال
نیزوں کی نوک پر بھی نہ تڑپا، حسینؓ تھا

کس نے دئے ہیں تم کو شفق، چاندنی، حیا
پوچھا تھا میں نے چاند سے، بولا حسینؓ تھا

ایرجؔ شیعہ، سُنی حوالوں کو بھول کر
بس یاد رکھ نبیؐ کا دُلارا حسینؓ تھا



غزل

اپنا آپ ہی ارپن کرنے آیا ہوں
سب کو اپنا دُشمن کرنے آیا ہوں

اپنی آنکھوں اور تمہاری اکھیوں میں
رم جھم رم جھم ساون کرنے آیا ہوں

دل دریا ہو یا دریا دل ہو کوئی
ہر ہردَے کو درپن کرنے آیا ہوں

پیش رؤں سے حلف اٹھا کر لالچ کا
دھنوانوں کو نِردھن کرنے آیا ہوں

دن دربار میں کچّے سیبوں کی چوری
زندہ اپنا بچپن کرنے آیا ہوں

چُوس کے سب آلودگیاں ماحول سے میں
خارستان کو گلبن کرنے آیا ہوں

اس مردہ بستی کے سب فنکاروں کی
دل دھڑکن میں چھن چھن کرنے آیا ہوں

نقلی چہرہ منہ پہ سجانے والوں کی
اصلی صورت روشن کرنے آیا ہوں

چھین کے اُس سے اس کی سوچوں کا زنار
ایرج سے میں اَن بَن کرنے آیا ہوں

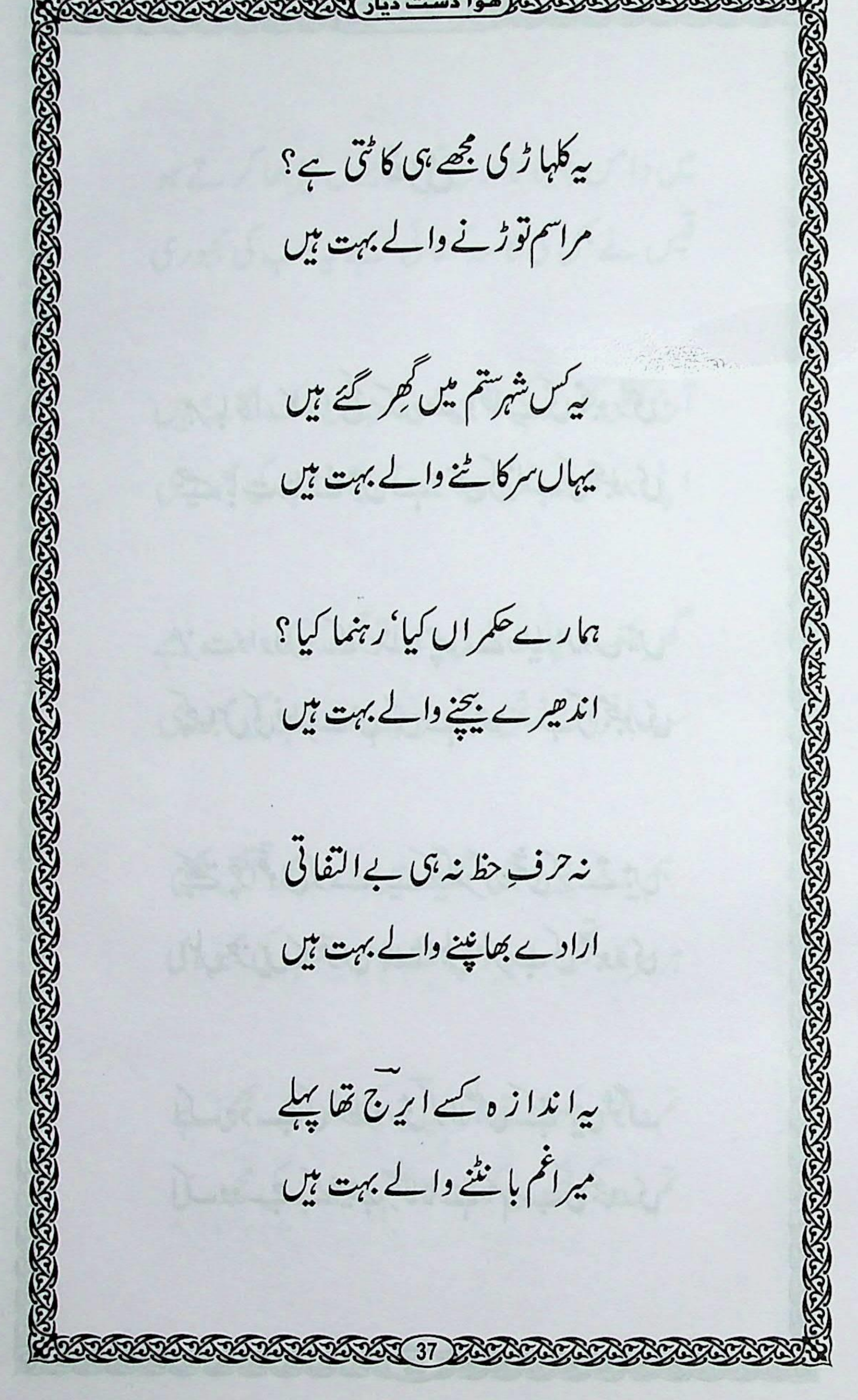
غزل

دلوں کو آ نکنے والے بہت ہیں
ابھی سچ بولنے والے بہت ہیں

تو چہرہ لاکھ پردوں میں چھپالے
ترے پہچاننے والے بہت ہیں

بہت اچھا ! کیا ترکِ تعلق
مرے بھی چاہنے والے بہت ہیں

مجھے "ہونے نہ ہونے" کی خبر کیا!
یہ باتیں سوچنے والے بہت ہیں



یہ کلہاڑی مجھے ہی کاٹتی ہے؟
مراسم توڑنے والے بہت ہیں

یہ کس شہرِ ستم میں گھِر گئے ہیں
یہاں سر کاٹنے والے بہت ہیں

ہمارے حکمراں کیا، رہنما کیا؟
اندھیرے بیچنے والے بہت ہیں

نہ حرفِ حظ نہ ہی بے التفاتی
ارادے بھانپنے والے بہت ہیں

یہ اندازہ کسے اے رجؔ تھا پہلے
میرا غم بانٹنے والے بہت ہیں

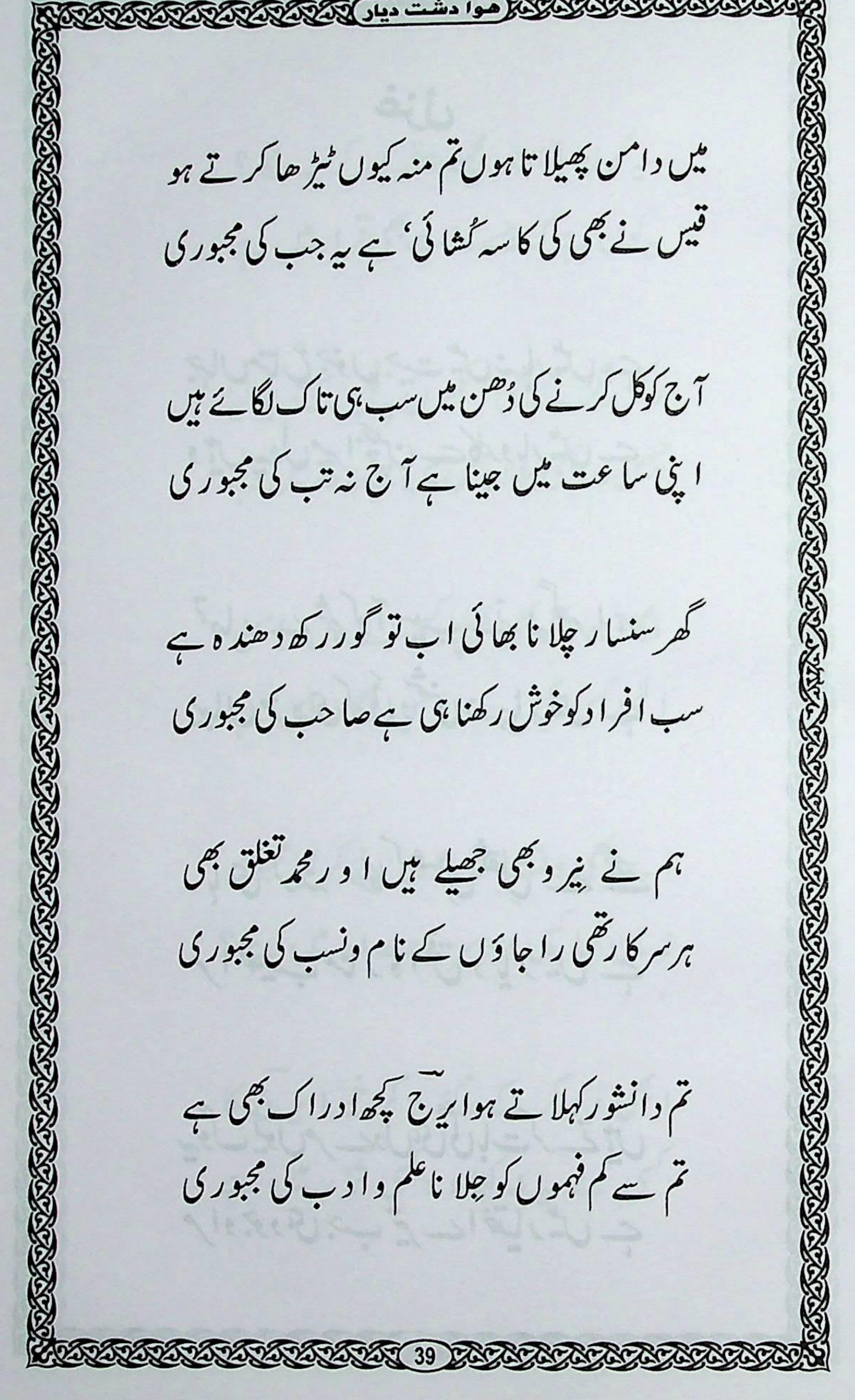


ہر بازار کا رائج سکہ رسد و طلب کی مجبوری
جیسے بات بنانے میں ہے ذہن کی، لب کی مجبوری

عزت داروں کے دستار اچھالے دنیا داروں میں
کچھ اس کی فطرت ہی یہی ہے کچھ منصب کی مجبوری

بجھتے چراغوں کو لے دے کر گھر کو روشن کرتے ہیں
اہلِ حزیں کا خون جلانا اہلِ طرب کی مجبوری

اک دوجے کی نقطہ وری کو لاعلمی کہتے ہیں لوگ
اک دوجے کے عیب گِنانا ہے ہم سب کی مجبوری



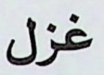
میں دامن پھیلاتا ہوں تم منہ کیوں ٹیڑھا کرتے ہو
قیس نے بھی کی کاسہ کُشائی ، ہے یہ جب کی مجبوری

آج کو کل کرنے کی دُھن میں سب ہی تاک لگائے ہیں
اپنی ساعت میں جینا ہے آج نہ تب کی مجبوری

گھر سنسار چلانا بھائی اب تو گورکھ دھندہ ہے
سب افراد کو خوش رکھنا ہی ہے صاحب کی مجبوری

ہم نے نیرو بھی جھیلے ہیں اور محمد تغلق بھی
ہر سرکار تھی راجاؤں کے نام ونسب کی مجبوری

تم دانشور کہلاتے ہو ایرج کچھ ادراک بھی ہے
تم سے کم فہموں کو چلانا علم وادب کی مجبوری



غزل

جہاں متاعِ جنوں جیت میں نہ ہار میں ہے
وہیں پہ دل میرا بچپن سے کاروبار میں ہے

تمہارے شہر کو آسیب نے نہ گھیرا ہو
یہاں مزہ ہی کوئی دشمنی نہ پیار میں ہے

رہا ہی کر نہ سکا کششِ ثقلِ سے مجھے
مرا نصیب منارہ افق دیار میں ہے

یہ لوگ کیوں مرے دل ہی کی بات کرتے ہیں
مرا وجود ہی جب تیرے اختیار میں ہے

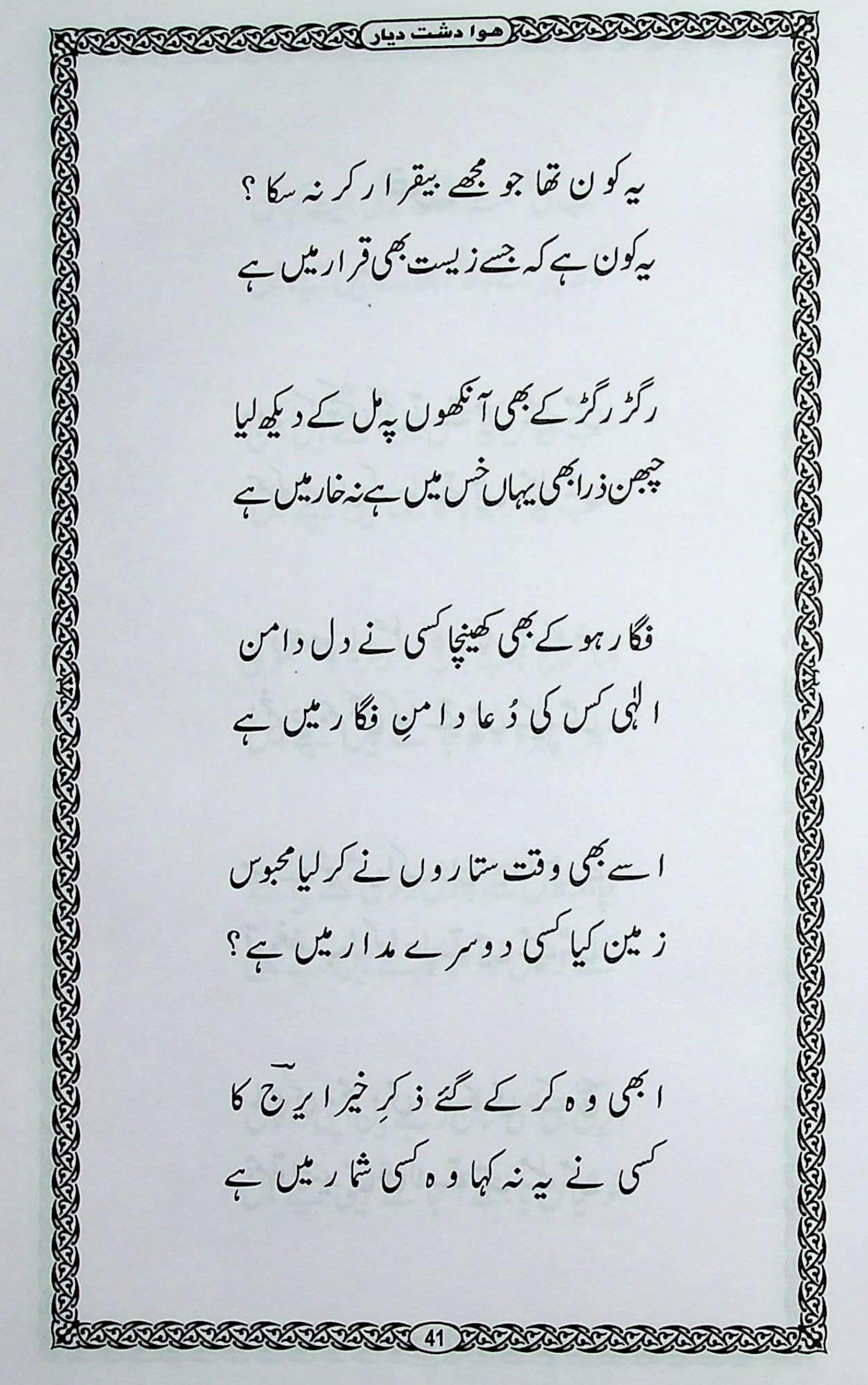
یہ کون تھا جو مجھے بیقرار کر نہ سکا ؟
یہ کون ہے کہ جسے زیست بھی قرار میں ہے

رگڑ رگڑ کے بھی آنکھوں پہ مل کے دیکھ لیا
چبھن ذرا بھی یہاں خس میں ہے نہ خار میں ہے

فگار ہو کے بھی کھینچا کسی نے دل دامن
الٰہی کس کی دُعا دامنِ فگار میں ہے

اسے بھی وقت ستاروں نے کرلیا محبوس
زمین کیا کسی دوسرے مدار میں ہے؟

ابھی وہ کر کے گئے ذکرِ خیر ایرؔج کا
کسی نے یہ نہ کہا وہ کسی شمار میں ہے



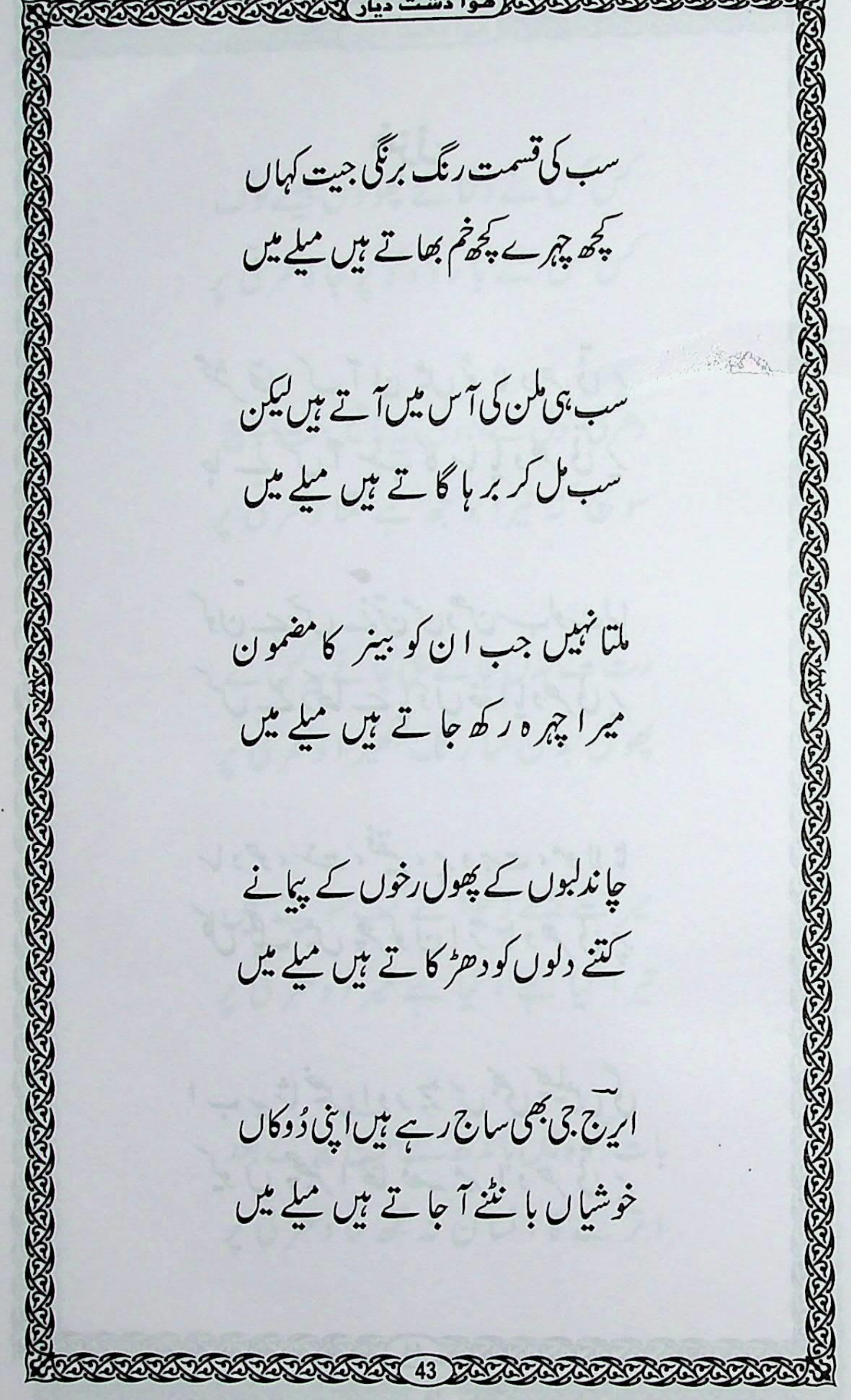
غزل

دور کے پکشی بھی آتے ہیں میلے میں
ہم کو حیراں کر جاتے ہیں میلے میں

یاد کا ہو یا وصل کا یا پھر ہجر کا ہو
زخم نیا ہم بھی کھاتے ہیں میلے میں

میرے شہر میں اک دن ایسا آتا ہے
قہر وغضب ڈاکو ڈھاتے ہیں میلے میں

مایوسی ، محرومی ، ناکامی کے بیچ
ہم تو امیدیں ہی لاتے ہیں میلے میں



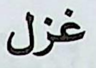
سب کی قسمت رنگ برنگی جیت کہاں
کچھ چہرے کچھ خم بھاتے ہیں میلے میں

سب ہی ملن کی آس میں آتے ہیں لیکن
سب مل کر برہا گاتے ہیں میلے میں

ملتا نہیں جب ان کو بینر کا مضمون
میرا چہرہ رکھ جاتے ہیں میلے میں

چاند لبوں کے پھول رخوں کے پیمانے
کتنے دلوں کو دھڑکاتے ہیں میلے میں

ایرجؔ جی بھی ساج رہے ہیں اپنی دُوکاں
خوشیاں بانٹنے آ جاتے ہیں میلے میں



محشر تھا اک آن میں ٹوٹا دھرتی پر
جانے کس آسیب کا سایا دھرتی پر

کون ہے جس نے تن من دھن سب لوٹ لیا
کس نے رکھا ہے پاؤں خدایا دھرتی پر

سادھو، سنت، فقیر، پروہت، مولانا
کل یگ میں پھر کون اترتا دھرتی پر

اب یہ شاخیں اور جڑیں بھی پھیلیں گی
کیوں چھیڑا تھا قصہ میرا دھرتی پر

کس کس نے دفنائے پھولوں جیسے لوگ
کس کس نے بارود کو پوجا دھرتی پر

دھرتی گول ہے، ہوگی، یہ باتیں مت سوچ
سوچ کہ تیرا بوجھ ہے کتنا دھرتی پر

رت کے بدل جاتے ہی جانے یہ کس نے
پھول بدن سا رنگ بکھیرا دھرتی پر

میرے جیسے دیوانے کب سوچتے ہیں
تیرا کیا ہے، کیا ہے میرا دھرتی پر

بات گرہ میں باندھ لے ایرجؔ میرے بعد
اترے گا انسان نہ مجھ سا دھرتی پر

غزل

اس سلیقے سے زندگی کی ہے
دشمنوں سے بھی دوستی کی ہے

جانے کس دیش کی ہے یہ مخلوق
دل جلایا ہے روشنی کی ہے

کیا کوئی اجنبی پرندہ تھا ؟
میرے بالیں پہ خودکشی کی ہے

تم سے آنکھیں ملی تھیں ، یاد آیا
یہ مصیبت اُسی گھڑی کی ہے

ہم بھی ہیں با خدا افعی سیرت
کچھ کسر ہے تو کینچلی کی ہے

قتل ہوتے ہی کہہ دیا حلفاً
یہ ادا بھی تو سادگی کی ہے

جو ہے کچرے میں منہ چھپائے ہوئے
اُس میں بُو باس آدمی کی ہے

میرے افکار بیچنے کی بات
اس صدی کی کہ اُس صدی کی ہے

ہم نے نروان کیلئے اریج
جانے کس کس کی بندگی کی ہے

غزل

وہ جیسی چھپ میں ہو ہنگامہ کر کے ضد کر لے
میں چاہتا ہی نہیں بن سنور کے ضد کر لے

بضد ہمیشہ رہا اب کے دل میں اتروں گا
کبھی تو ایسا ہو دل میں اتر کے ضد کر لے

وہ آیا، طاق پہ بیٹھا اُسے اُڑا کے کہا
قدم نہ لینا ابھی نامہ بر کے ضد کر لے

اتر کے ہم کو دکھائے ہوا کے گھوڑے سے
ذرا سی دیر کو ٹھہرے، ٹھہر کے ضد کر لے

یہی تقاضا ہے روکوں میں پیش دستی کو
کہ اس کے سر سے بھی آنچل نہ سرکے ضد کر لے

ابھی تو بات کوئی مان کے دکھائے ذرا
اور اس کے بعد ہی وہ جی کتر کے ضد کر لے

کوئی دباؤ نہ الزام ڈالئے اُس پر
مزہ نہیں ہے کہ وہ ہم سے ڈر کے ضد کر لے

ستارے توڑ کے لانے کی کیا ضرورت ہے
اکھاڑ ڈال در و بام گھر کے ضد کر لے

نئے زمانے کی سوہنی ہوں لوٹ آونگی
ندی گھڑے پہ ابھی پار کر کے ضد کر لے

غزل

گھر کے اندر نہیں دہلیز تک آ کر جاتے
ٹوکتا کون انہیں ہاتھ ملا کر جاتے

دل اندھیروں کی نہ کرتے نہ شبِ تار کی بات
وہ اگر دیپ محبت کا جلا کر جاتے

اُن سے شکوہ ہے اگر کوئی تو بس اتنا ہے
میرے ہنسنے پہ تھی بندش تو رلا کر جاتے

آ گئی فصلِ طلب یاد کی کونپل پھوٹی
رُت بچھڑنے کی نہ تحفے میں دلا کر جاتے

وہ تو پردے کے ہی قائل ہیں نہ پردے کے خلاف
مجھ سے پردہ تھا تو چہرہ نہ دکھا کر جاتے

اور تھے نادرونایاب علل مروانے کے
زہر سانسوں کا ہی خوشبو میں چھپا کر جاتے

اتنا ہی کرتے اگر ہار تھی میری مقصود
چند پل میری انا مجھ سے چرا کر جاتے

اذن ملنے کا تو تھا آنکھ مٹکئے کا نہیں
ایسا ہی کھیل کوئی پھر سے رچا کر جاتے

جانے والے کہاں سنتے ہیں کسی کی ایرج
پر کہاں جائیں گے بس اتنا بتا کر جاتے

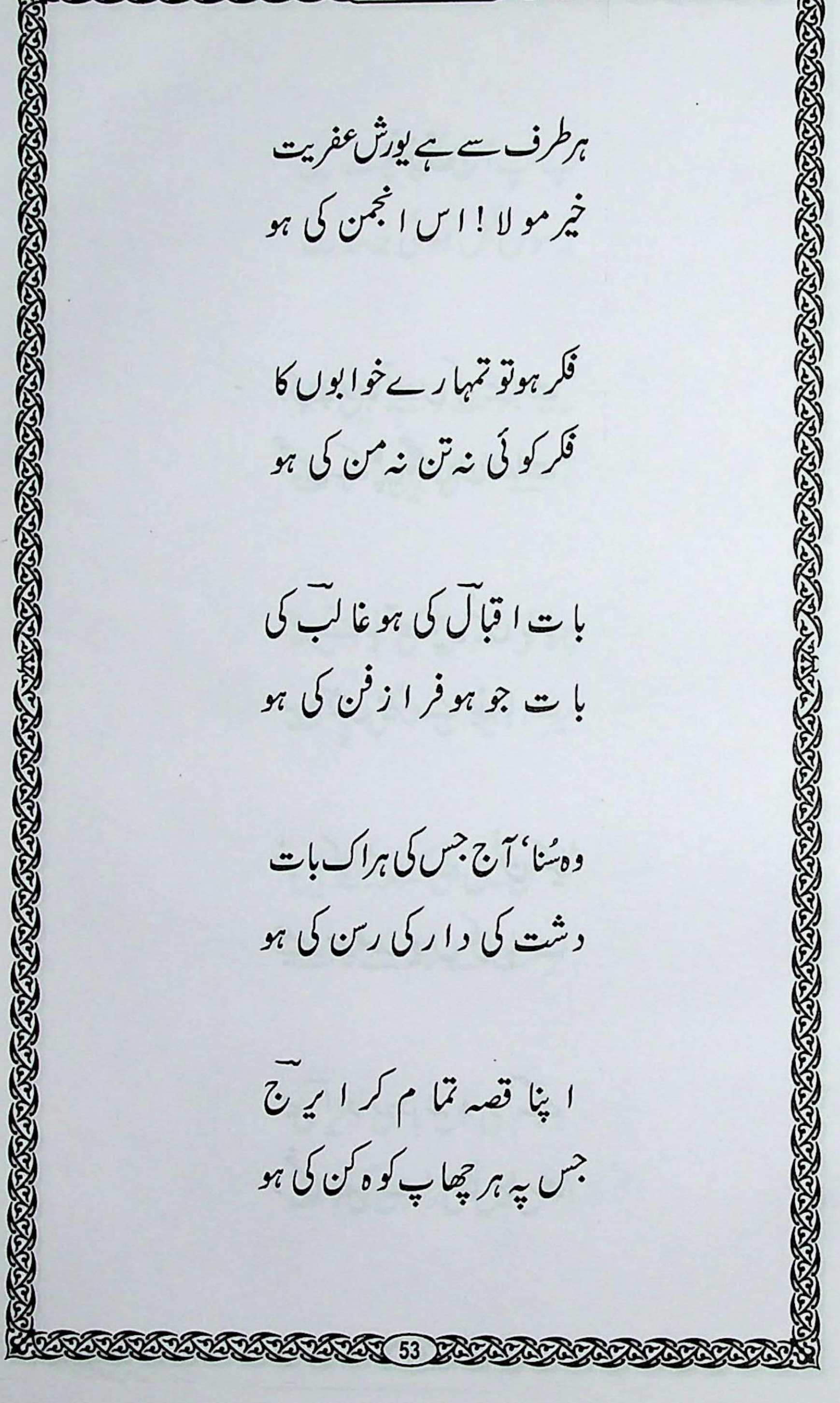
غزل

حُسن کی، چاہ کی، نہ دھن کی ہو
حکمرانی ترے سخن کی ہو

تجزیہ ایسی روشنی کا کریں
چھوٹ جس پر ترے بدن کی ہو

عمر بھر ہم نہ کر سکے یارو
اب کوئی بات بانکپن کی ہو

شوق آوارگی میں میری طرح
کیوں ہواؤں پہ زد وطن کی ہو



ہر طرف سے ہے یورش عفریت
خیر مولا ! اس انجمن کی ہو

فکر ہو تو تمہارے خوابوں کا
فکر کوئی نہ تن نہ من کی ہو

بات اقبالؔ کی ہو غالبؔ کی
بات جو ہو فرازؔ فن کی ہو

وہ سُنا، آج جس کی ہر اک بات
دشت کی دار کی رسن کی ہو

اپنا قصہ تمام کر ا یرجؔ
جس پہ ہر چھاپ کوہ کن کی ہو



دی چند سانسوں کی خیرات
چھین کے پل چھن دن اور رات

تیرے ہاتھ ہیں سُن بابا
سرد نہیں میرے جذبات

خود کو میں نے دفن کیا
جیسے ہو صدیوں کی بات

میرا درد نہ وہ سمجھے
زخمی میرے احساسات

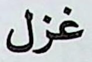
ٹپ ٹپ آج بھی چھت ٹپکی
برسوں قبل ہوئی برسات

کتے بھونک رہے ہیں سنو
آنے والی ہیں آفات

پھول بنوں کی رانی تو
میرا جیون اگنی پات

ٹینشن میں ہی گذرتے ہیں
فرصت کے سارے لمحات

رآم کی بن باسی اریج
اصل میں تھی راون کی مات



غزل

سلگتی دھوپ تھی، دشت وجبل تھے، بنجر تھے
جہاں جہاں سے بھی گذرے عجیب منظر تھے

جو ماں کی کوکھ سے نکلے تری تلاش رہی
لحد نصیب ہوئی جب بھی تیرے خوگر تھے

بدل چکی ہے اچانک حرارتِ ارضی
جوالا پھوٹ رہے ہیں جہاں سمندر تھے

سراب جیسے گذاری ہے زندگی ہم نے
کہ دور ہی سے لبھانے میں ہم ہنرور تھے

یہی تھا فرق پر اجے میں میری جیت میں اُن کی
صُلح پسند تھا میں اور وہ زور آور تھے

نہ بت تراشے نہ پوجے نہ توڑ ڈالے مگر
کسی بھی شہر میں آئے بہ شکلِ آزر تھے

ہماری موت سے پہلے ہی کتنے لوگوں نے
ہمارے بارے میں لکھا تھا ہم گداگر تھے

میں جن کے بیچ میں لیٹا تھا بے حس وحرکت
لُٹے پٹے تھے مسافر کٹے ہوئے سر تھے

وہ دن کہ ماں کی دعائیں پناہ تھیں ایرجؔ
کنول تھے، رات کی رانی تھے ہم گُلِ تر تھے

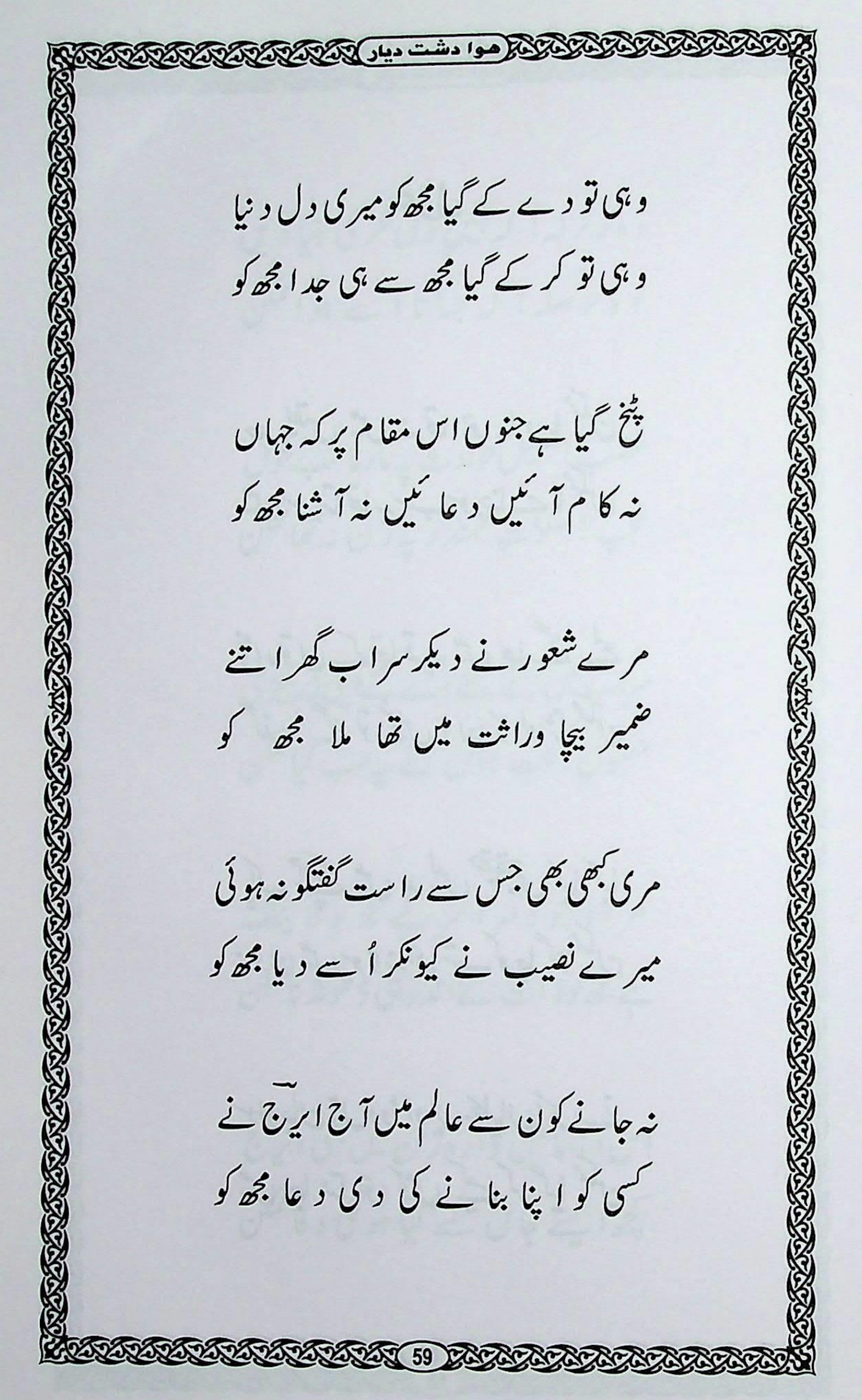
غزل

بطرفِ دشت طلب لے گئی وفا مجھ کو
نئے حوالوں سے کرنا تھا آشنا مجھ کو

بچھڑ گیا جو مرا سایہ بن کے چلتا تھا
یہ کن اندھیروں نے اُس سے جدا کیا مجھ کو

بہار آتے ہی ہر سمت پھول کھلتے ہیں
بہار آئی تھی ایسا مگر لگا مجھ کو

وہی بتا کے گیا ورع کیا ہے تقویٰ کیا
وہی فریب کی بو باس دے گیا مجھ کو



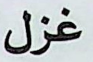
وہی تو دے کے گیا مجھ کو میری دل دنیا
وہی تو کر کے گیا مجھ سے ہی جدا مجھ کو

پہنچ گیا ہے جنوں اس مقام پر کہ جہاں
نہ کام آئیں دعائیں نہ آشنا مجھ کو

مرے شعور نے دیکر سراب گھر اتنے
ضمیر بیچا وراثت میں تھا ملا مجھ کو

مری کبھی بھی جس سے راست گفتگو نہ ہوئی
میرے نصیب نے کیونکر اُسے دیا مجھ کو

نہ جانے کون سے عالم میں آج ایرؔج نے
کسی کو اپنا بنانے کی دی دعا مجھ کو



حدِ یقیں میں نہ تھا جو بنا دیا ممکن
میں سوچتا تھا یہ سب سوچنا ہے ناممکن

نئی رتوں کے تعاقب میں بھاگتے لمحے
گذر گئے تو نہیں ان کا لوٹنا ممکن

پلک جھپکنے میں بدلیں حقیقتیں کیا کیا
نہ دن میں سونا نہ ہی شب کو جاگنا ممکن

سوادِ جان میں دوڑا دیں بجلیاں اُس نے
میں جانتا ہی نہیں کیسے کر گیا ممکن

وہ زلزلہ! کہ ہلیں دل نگر کی بنیادیں
وہ حوصلہ! کہ بسانا اِسے ہوا ممکن

غضب! فصیل حوادث پہ مارنا شب خوں
عجب! سکوتِ سمندر پہ رَن نہ تھا ممکن

سراب میں نے لئے دے کے اپنی زرخیزی
حصولِ دشتِ ہوس نے یہ سب کیا ممکن

مراو جو دسرا سر ہے جُز وِ لا ینفک
ہے مجھ کو ذات کے اندر ہی ڈھونڈنا ممکن

اس آزمائشِ دار و رسن میں بھی ایرجؔ
کچھ ایسے جاں سے گیا ہو گئی وفا ممکن

غزل

اس طرح ہی دے حوصلہ کوئی
پھر کوئی لفظ پھر دعا کوئی

تیرے احساں کے زیر بار ہیں سب
کیا کرے اپنا حق ادا کوئی

تم سے بچھڑا تو غم نے اپنایا
مل گیا دل کو آسرا کوئی

ٹارنیڈو کی مار دیکھیں سب
شدت درد دیکھتا کوئی

لاش جس کی پڑی تھی آنگن میں
کہتے ہیں اجنبی نہ تھا کوئی

ہم کو ضد ہے وہاں پہ رہنے کی
غیر ہو اور نہ آشنا کوئی

اب ٹیلیفون کی نہ خط کی بات
کہتے موبائل پر ملا کوئی

تیری سن گن ملی تو باز آیا
ورنہ جاں اپنی دے ہی دیتا کوئی

ایرج ہرزہ سرا ہی تو نکلا
تیری نیت نہ جان پایا کوئی

غزل

کس سے کہوں کہ میرا بھی ہے آشنا کوئی
تری گلی میں نہ ہو جائے حادثہ کوئی

یہ ٹوٹ پھوٹ مری ہی ہوئی کہوں کیسے؟
نہیں مرا بھی ابھی مجھ سے رابطہ کوئی

جسے بھی دیکھو مرے زخمِ دل کے درپے ہے
کبھی تو حال مری صورت سے جانتا کوئی

میں شہرِ سنگ میں کرتا ہوں عکس عکس عیاں
یہ سانحہ ہے یہاں بھی ہے آئینہ کوئی

کسی میں تاب کہاں جو تری زباں سمجھے
اشارے ہوں کہ کنائے کہ ہوا دا کوئی

تمہارا لمس چھُوا سب نے ہی ملا یا ہاتھ
اور اس پہلے محبت سے کب ملا کوئی

وہ نامہ بر سے کہے چاہے بھیجدے ای میل
ہے انتظار میں اُس کے جواب کا کوئی

یہ اور بات! کہ رہتا ہوں میں بھی دستِ سوال
یہ اور بات! کہ دیتا نہیں دعا کوئی

خدا کی دین ہے ایرج تمہارا لہجہ بھی
اِسے نہ توڑ سکے گی نئی ہوا کوئی

غزل

وہ جانتا بھی نہ تھا اپنا کہہ دیا مجھ کو
یہی بہت ہے کوئی آشنا ملا مجھ کو

ستارہ جسم، کنول ہونٹ، کہکشاں آنکھیں
عجب وجود، عجب چھب دکھا گیا مجھ کو

گلاب بستی میں کانٹے اُگانے آیا ہوں
اُسے کہے کوئی اب کے نہ دے صدا مجھ کو

یہ اُس نے پوچھا تھا مجھ سے پروتے پوجا پھول
میں اپنا سیس جھکاؤں کہاں بتا مجھ کو

پرندے چنتے رکھا ہاتھ اس نے مینا پر
یوں اپنے نام سے کرنا تھا آشنا مجھ کو

میں اُس کے ہجر کی لذت میں گم ہوں برسوں سے
اُسے یہ زعم کہ دیتا رہا سزا مجھ کو

وہ کر کے آیا سواری سفر سفینوں میں
رسد سے پہلے ہی حیرت نما کیا مجھ کو

خود اپنی ذات کی تکمیل کا ہے اندازہ
مگر یہ سوچ نہ پایا کہ کیا ہوا مجھ کو

وہ گُل زمینوں میں ٹھہرا تھا زخم بھرا یرج
دکھا کے خواب جزیروں کی انتہا مجھ کو

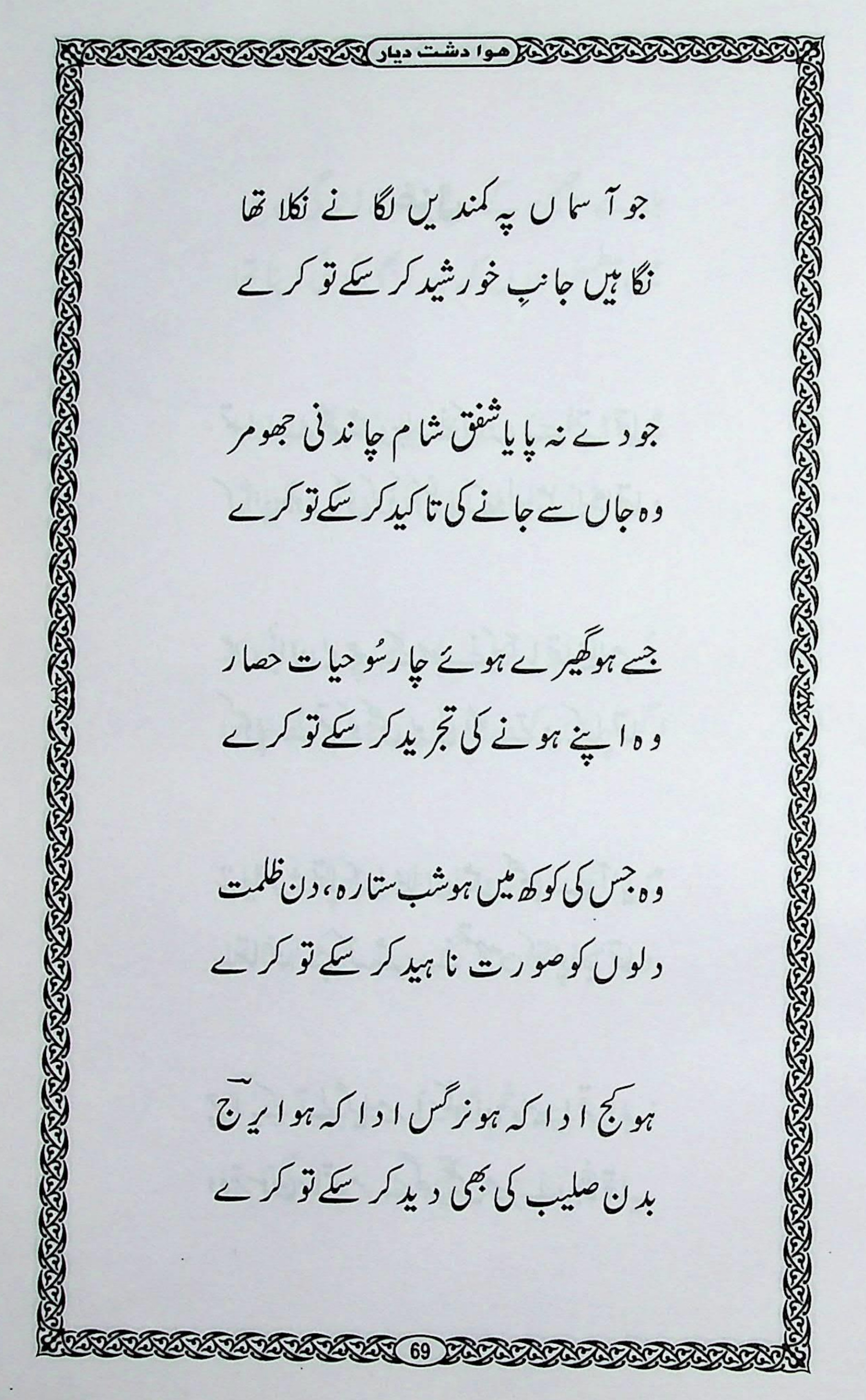
غزل

مرے کہے پہ وہ تنقید کر سکے تو کرے
خود اپنی بات کی تردید کر سکے تو کرے

یا اپنے قول سے پھر جائے دوسروں کی طرح
یا اپنے عہد کی تجدید کر سکے تو کرے

وہ پورا سال مرے ساتھ رہ نہیں پاتا
مرے بغیر مگر عید کر سکے تو کرے

ہے اپنا ظرف بڑھانے کی سعی میں سرگرداں
وہ میرے جھوٹ کی تائید کر سکے تو کرے



جو آسماں پہ کمندیں لگانے نکلا تھا
نگاہیں جانبِ خورشید کر سکے تو کرے

جو دے نہ پایا شفق شام چاندنی جھومر
وہ جاں سے جانے کی تاکید کر سکے تو کرے

جسے ہو گھیرے ہوئے چار سُو حیات حصار
وہ اپنے ہونے کی تجرید کر سکے تو کرے

وہ جس کی کوکھ میں ہو شب ستارہ، دن ظلمت
دلوں کو صورت ناہید کر سکے تو کرے

ہو کج ادا کہ ہو نرگس ادا کہ ہوا یرج
بدن صلیب کی بھی دید کر سکے تو کرے

غزل

تمہارے شہر میں جانے کہاں سے اترا تھا
کہ اُن دنوں بھی کوئی اُس کے دل میں بستا تھا

میں جان بوجھ کے ہونے کو آیا تھا نیلام
کسی نے تم کو بھی بولی لگاتے دیکھا تھا

یہ حادثہ تھا کہ ایمان میں بھی لے آیا
یہ سانحہ ہے کہ میں نے تمہیں کو پوجا تھا

چرا کے لے گیا میرا سکون، میرا قرار
وہ برسوں ساتھ مرے گھر میں میرے رہتا تھا

بلا سے، چھین کے لے جائے زندگی میری
میں مطمئن ہوں کہ میرا ابھی کوئی اپنا تھا

میں اس طرح سے بِکا، یوں لٹا، پھر ایسا ہوا
وہ اپنی ''طوطا کہانی'' سنانے آیا تھا

اُسے سدا ہی رہا زعم پارسائی کا
اگرچہ اس کو درندوں نے روز نوچا تھا

میں اپنی بے سروسامانیاں چھپاؤں کیا؟
وہ ہمسفر تھا مرا جس نے مجھ کو لوٹا تھا

زباں سے زخم لگانے سے باز آ ایرجؔ
یہ زخم مانا، تجھے بار بار لگتا تھا

غزل

تیرے شہر میں آنا جانا پڑتا ہے
جھوٹ، کہ ہو سچ کچھ تو بتانا پڑتا ہے

مِل جائیں وہ جاں پہ مری بن آتی ہے
بچھڑیں تو بھی اُن کو بلانا پڑتا ہے

ضد کر کر کے انگلی انکو پکڑادی
بنتی کر کے ہاتھ چھڑانا پڑتا ہے

دور خلاء سے اُن کی تسلی کی خاطر
دل دنیا کا حال سنانا پڑتا ہے

مینا آنکھوں اپنے لب پیمانوں سے
لمس سمندر اُن کو پلانا پڑتا ہے

شام شفق شب شعلہ شبنم شیرازہ
تیرا ذکر ہو سب کو آنا پڑتا ہے

آج بھی دریا میں نے گھڑے پر پار کیا
گاؤں کا دستور نبھانا پڑتا ہے

دن لمحوں کا ماتم ہو یا شب نوحہ
ہر اک دکھ مجھ کو ہی اٹھانا پڑتا ہے

وارتے ہیں ایرجؔ ہم ان پر تن کا فور
اور کبھی ٹھینگا بھی دکھانا پڑتا ہے

غزل

نہ دوست ہے، نہ ستمگر، نہ مال ہے بھائی
میں کس سہارے ہوں زندہ کمال ہے بھائی

ہو 'ازدواج کا' پیشے کا یا محبت کا
میں جانتا ہوں کہ رشتوں کا کال ہے بھائی

ہر آدمی کی نظر دوسروں کی جیب پہ ہے
ہماری قدروں کی وجہِ زوال ہے بھائی

رگوں میں خون، نہ لب پر دعا، نہ انگ رکھا
تمہارے شہر میں سب کا یہ حال ہے بھائی

یہ الگنی پہ ٹنگا میں ہوں یا مرے کپڑے
سنا ہے آج کا چبھتا سوال ہے بھائی

یہ اس صدی کا بڑا سانحہ نہیں ہے کیا؟
اداس میں ہوں اُسے بھی ملال ہے بھائی

گُہار کیسے لگاتا میں امن عالم کی
کہ میرا گھر کسی رن کی مثال ہے بھائی

بہم ہوئے بھی تو کیا، ملنے کی سبیل نہیں
بچھڑنے کا ہی بہت احتمال ہے بھائی

بدن دریدہ، جگر سوختہ، کلیجہ شق
شکستہ اس سے بھی ایرجؔ کا حال ہے بھائی

غزل

اِن قاتلوں کے ساتھ منانے نہیں آیا
مرنے سے قبل دل میں سمانے نہیں آیا

یوں بھی تو زندگی ہے لہو آگ کا دریا
کیوں اس میں درد و رنج ملانے نہیں آیا

سجدوں کا داغ اُس نے چھپایا تھا جبیں پر
دل کی کدورتوں کو چھپانے نہیں آیا

اک عمر سے جو ہم نے بسایا ہے گھروندا
اس کو وہ کارِ خیر میں ڈھانے نہیں آیا

اس نے سنائی پیار سے حمزہ کی داستان
ہاں ! قاف کی پریوں کو دکھانے نہیں آیا

سب عیب سہی میرے ہی ہمزاد میں لیکن
سید ھا سمجھ کے مجھ کو بنانے نہیں آیا

شاید میں اس لئے نہ چڑھا گرگٹوں کی بھینٹ
وہ رنگ بدلنے کے بہانے نہیں آیا

بلبل میں ، گُلفروش میں ، شبنم میں جنگ تھی
کیوں اِن میں تو ہی صلح کرانے نہیں آیا

وہ چاند ہے ، چکور ہے ، ایرج کہ کہکشاں
کھولی نہ بات مجھ کو لبھانے نہیں آیا

غزل

تاک جھانک کرتے ہو کیسے پریمی ہو
ممکن ہے چلمن کے پیچھے کوئی ہو

پریم سنگھاسن پر بھی بٹھا لینا ہی اگر
چیسٹٹی کی بیلٹ نہ اس نے پہنی ہو

وہ رستے اپناتا ہوں جن رستوں میں
دھوپ تمازت، ہجر اداسی بچھتی ہو

قرنوں سے دل آزاری کرتا آیا
میرے بعد مرا سچا وارث بھی ہو

ہم دونوں اس راہگزر میں پلے بڑھے
فرق ہے میں منتر تم جادوگرنی ہو

دیش نکالا دیکر مجھ کو، وہ بولی
کیا کوئی ہے جس نے بات نہ سمجھی ہو

میں آدم خور، سب ہی خائف ہیں مجھ سے
میرے پہلو میں تم کیوں کر آئی ہو

رِستا ہے ہر زخم جہاں تم کو دیکھوں
لگتا ہے ہر سمت تم ہی تم بیٹھی ہو

آج قد و قامت ہے تمہارا جوبن پر
آج بھی تم ایرجؔ سے برسوں چھوٹی ہو

غزل

چاند میں نور ستاروں میں شرر دیکھا ہے
جب بھی آنکھوں میں تری عکسِ سحر دیکھا ہے

کون ہے جس نے بُلایا ہے پہاڑوں سے مجھے
کون تھا جسکی دعاؤں میں اثر دیکھا ہے

کیسی بستی ہے یہ کس طرح کے باسی ہیں یہاں !
جو ملا ، اُس کے دل و جان میں ڈر دیکھا ہے

خواب ہے یا ہے حقیقت ، کہ نظر کا دھوکہ
اپنے کاندھوں پہ کسی اور کا سر دیکھا ہے

اپنی اولاد کے آگے جو ہوا دستِ سوال
اس کی آہوں نہ دعاؤں میں اثر دیکھا ہے

اس سے پہلے کہ میں آرام سے رکھتا پاؤں
اس سے پہلے ہی کسی اور نے گھر دیکھا ہے

ہاتھ بھی خالی رہے راہ میں کھائی ہو پہاڑ
جب بھی نکلے ہیں کہاں زادِ سفر دیکھا ہے

وہ جو اپنے تھے، جو اپنائے ہوئے اپنے تھے
وہ الگ، میں بھی جدا، کس نے مگر دیکھا ہے

بے ہنر مجھ کو سمجھنا نہ مظفرؔ ایرج
سب نے دل جوڑنے کا میرا ہنر دیکھا ہے

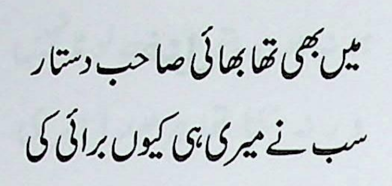
غزل

رنگ کی ہو نہ روشنائی کی
بات ہو آپ تک رسائی کی

بوجھ میں نے اٹھایا تھا سر پر
میری ٹانگوں نے بے وفائی کی

آئینہ دیکھا اور پردہ کیا
ہے ادا یہ بھی منہ دکھائی کی

جاتے جاتے پلٹ کے رُت آئی
دل زمینوں میں کیوں بوائی کی



میں بھی تھا بھائی صاحب دستار
سب نے میری ہی کیوں برائی کی

یہ ہے ادراک کی نئی صورت
آشناؤں سے آشنائی کی

لاجونتی ہو رات کی رانی
ان کی خوشبو ندا جدائی کی

بد دعا دی نہ ہی دعا اُس نے
میرے مولا نے ناخدائی کی

کچھ دنوں میں ہوا عدو ارج
میں نے جس شخص سے بھلائی کی

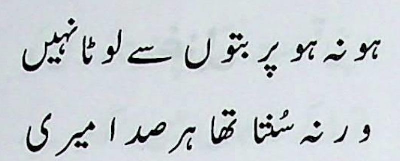
غزل

وہ اگر سنتا التجا میری
یوں بڑھاتا نہیں سزا میری

ایک ہی پل میں چھوڑ کر چلدی
وہ کہ تھی درد آشنا میری

کچھ کہا کچھ سنا نہیں اس نے
پیش قدمی سمجھ گیا میری

یوں مسلتا نہ لب کنول میرے
حالتِ زار پوچھتا میری



ہو نہ ہو پربتوں سے لوٹا نہیں
ورنہ سُنتا تھا ہر صدا میری

مانگتا ہی رہوں گا میں جب تک
رنگ لے آئے گی دعا میری

وہ خلاء باز میں ہوں جل باسی
اس کی دنیا الگ، جدا میری

سب پرندے ہیں گھونسلوں میں اداس
کیوں مخالف ہوئی ہوا میری

پار ایرج بخیر اترے گا
اب سنے گا مرا خدا میری

غزل

اب تیقن گمان میں رکھ دے

تیر اپنا کمان میں رکھ دے

زیر ہو جائے جو مقابل ہو

وہ حلاوت زبان میں رکھ دے

تجھ سے تلوار ہی سنبھلتی نہیں

مشورہ سُن میان میں رکھ دے

حرف سے صوت، صوت رشتوں کی

پھر وہی لفظ دھیان میں رکھ دے

اپنی قسمت کے چاند تاروں کو
توڑ کر آسمان میں رکھ دے

جو چرائے بکاولی کا پھول
ایسا منتر بھی گیان میں رکھ دے

پانوردی کے تجربوں کو بھول
سمت کوئی اڑان میں رکھ دے

کھل اٹھے گی رفاقتوں کی دھوپ
مصلحت خاکدان میں رکھدے

اُن کی باتوں کا زہر بھی ایرجؔ
اپنے دل اپنی جان میں رکھ دے

غزل

تقدیر کی وہ مار پڑی ڈر بھی ڈرے ہے
ایسا ستم ہوا کہ ستمگر بھی ڈرے ہے

یہ کیسا زہر میرے لہو میں اُتر گیا
دیکھو تو چاٹتے ہوئے خنجر بھی ڈرے ہے

پھر کسی نے آج سونامی کی منادی
لگتا ہے آج قعرِ سمندر بھی ڈرے ہے

اب پالتے ہیں لوگ درختوں پہ مچھلیاں
اُف! آنے والا وقت، شناور بھی ڈرے ہے

کیوں گومگو میں آ گیا وہ ، وقتِ امتزاج
دل کے پھپھولے پھوڑتے نشتر بھی ڈرے ہے

جس سمت دیکھتا ہوں نہ دشمن ہے نہ ہی دوست
اس تیرگی کو توڑتے خاور بھی ڈرے ہے

تاراج کر کے یوں گیا ہے کاروبارِ زیست
برتر ہے تذبذب میں تو ہمسر بھی ڈرے ہے

آلودگی فضا میں ہے اتنی ، اڑان میں
طائر بھی سوگوار ہیں شہپر بھی ڈرے ہے

ٹیکنالوجی کو دوڑ میں ، لفظوں کی جنگ میں
ایرج کا کیا شمار مظفر بھی ڈرے ہے

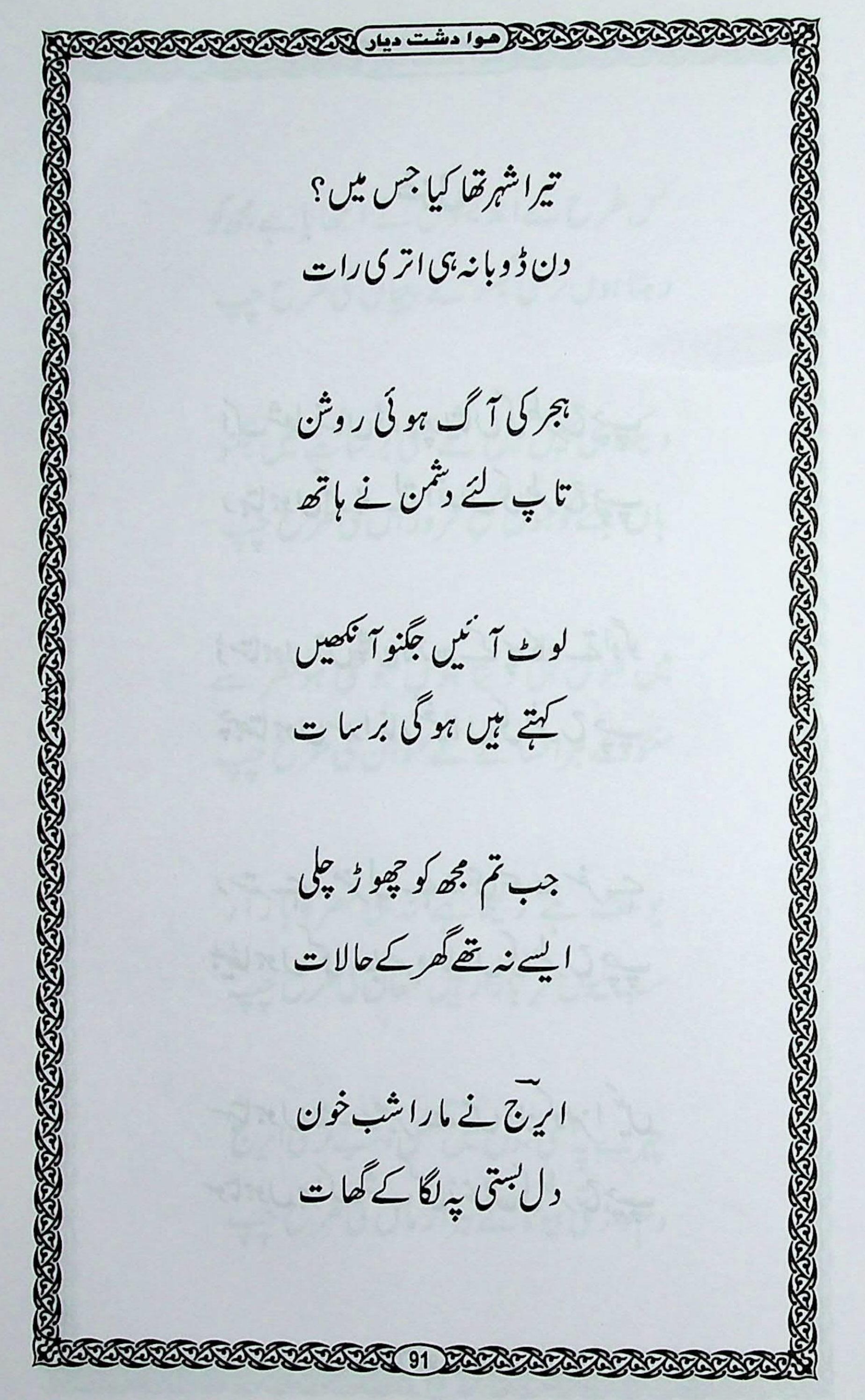
غزل

خوشیوں نے دیدی سوغات
غم، لاچاری، دُکھ، جذبات

دل بستی نہ، دھواں، نہ الاؤ
ہوگی کیسے بسر اوقات

تم آئے نہ تمہاری یاد
برسوں تھی تنہائی ساتھ

پھر نکلے اُس کوچے میں
پھر ہوگی جذبوں کو مات



تیرا شہر تھا کیا جس میں؟
دن ڈوبا نہ ہی اتری رات

ہجر کی آگ ہوئی روشن
تاپ لئے دشمن نے ہاتھ

لوٹ آئیں جگنو آنکھیں
کہتے ہیں ہوگی برسات

جب تم مجھ کو چھوڑ چلی
ایسے نہ تھے گھر کے حالات

اری آج نے مارا شب خون
دل بستی پہ لگا کے گھات

غزل

اک شعلہ فساں دُودِ پریشاں کی طرح چپ
رہتا ہوں مگر بولتے انساں کی طرح چپ

ڈستا ہوں میں پھن کاڑھ کے پھنکارتے لوگو
چبھتا ہوں سدا خارِ مُغیلاں کی طرح چپ

رستہ ہے نہ منزل ہے نہ ہی سمت سفر ہے
بیٹھا ہوں کسی بے سروساماں کی طرح چپ

سہتا ہوں بڑے صبر سے میں دن کو سزائیں
سوتا ہوں ہر اک شب کسی زنداں کی طرح چپ

کس طرح کے اندیشوں نے الجھایا ہے مجھ کو
رہتا ہوں تری گیسوئے پیچاں کی طرح چپ

دیکھا ہی نہیں میں نے بھی برسات میں جگنو
ہاں جلنے کو ہوں شمعِ فروزاں کی طرح چپ

میں کھول ہی دیتا ہوں جو مخفی ہو نظر سے
منٹو کے ہر افسانے کے عنوان کی طرح چپ

یوسفؑ ہے' زلیخا ہے' نہ ہی مصر کا بازار
سب کیوں سرِ بازار ہیں کنعاں کی طرح چپ

چہرے پہ ہنسی، دل میں گھٹن، شب تری ایرجؔ
دم توڑتی بیوہ کے ہر ارماں کی طرح چپ

غزل

اُس کو کاٹا ، اِس کو مارا ، اپنا بھی گھر لوٹ لیا
ہم ہی درندوں نے بچوں کے منہ کا فیڈر لوٹ لیا

موند کے آنکھیں اپنے پرایوں کے کپڑے تک نوچ لئے
بیٹے سے پستک چھینی بیٹی کا بستر لوٹ لیا

ہم سے سادہ دلوں کو ہی کچھ وردی پوش لیٹروں نے
خواب دکھا کر ، باغ سجا کر ، دل برما کر لوٹ لیا

آج جہاں جس شخص کی سُنئے ایک ہی بات زباں پر ہے
مسل کلارک نے پھاڑا ، افسر نے دفتر لوٹ لیا

میں تو لال پری کے دل میں جھولا جھولنے نکلا تھا
لیکن رستے میں رہبر نے میرا شہپر لوٹ لیا

جس سے گُر جینے کا سیکھا درسِ وفا جس سے پایا
مرتے ہی اُس شخص نے اُس کی گور کا پتھر لوٹ لیا

تیرے شہر کی حالت میرے شہر کی حالت جیسی ہے
تم نے مسجد ڈھائی تو میں نے بھی مندر لوٹ لیا

ایک پری پنگھٹ پر کل شب پنیا بھرن کو اتری تھی
ہم نے اُس کی گاگر توڑی جسم سمندر لوٹ لیا

سونے کی بھٹی میں پھینکا پھر سکوں میں ڈھال دیا
اور ہوس نے ایرجؔ صاحب دستِ ہنرور لوٹ لیا

غزل

سب کچھ تیاگ دیا تو جانی میں نے تمہاری مجبوری
اپنی کہو، کیا پوچھ رہے ہو مجھ سے میری مجبوری

عشق ہوا تو ساتھ اٹھائیں جینے مرنے کی قسمیں
تم نے نبھائیں میں نے ہی توڑیں اپنی اپنی مجبوری

سوچ سکے تو سوچ لے تو بھی اُس دل پر کیا کیا گذری
جس نے اٹھائی تیری خاطر اپنی پرائی مجبوری

کچھ جیتے ہیں زندہ دلی سے اور کچھ دھوم دھڑلے سے
ہم جیسے جینے والوں کا ہے جینا بھی مجبوری

تیرے شرن میں آئی تو سب سمجھے میں تیری ہی ہوئی
کیسے بتاؤں میں نے نبھائی مجبوری سی مجبوری

سات سروں کے ساگر میں ان آتی جاتی لہروں نے
ساحل ساز سرور و صدا کی ہم کو بتائی مجبوری

ایک یہی قانون ہے چلتا انسانوں کے جنگل میں
کچھ کچھ جینے کی پابندی کچھ مرنے کی مجبوری

شب بستی میں آنکھ پرندہ تک ہونی پر روتا ہے
دن سرحد پر شام پہیئے نے تھی دیکھی مجبوری

دھونی رمائی جس دن سے ایرجؔ نے قلندر شاہی میں
ننگ دھڑنگ ہی جی لینے کی سب سے چھپائی مجبوری

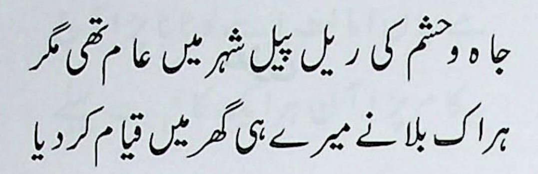
غزل

جو کوئی ہاتھ آ گیا اس کو غلام کر دیا
تم نے یہ کیسی رسم کو پل بھر میں عام کر دیا

تھوڑا سا مسکرا کے تو بولا تھا انتساب لکھ
میں نے کتابِ جان کو تیرے ہی نام کر دیا

ایک ہی جیسے خدوخال ایک ہی جیسی چال ڈھال
جو تھا تمہارے شہر کا اس کو سلام کر دیا

اہلِ خرد کے جال میں مجھ سا دیوانہ آ گیا
شام کو صبح لکھ گیا صبح کو شام کر دیا



جاہ و حشم کی ریل پیل شہر میں عام تھی مگر
ہر اک بلا نے میرے ہی گھر میں قیام کر دیا

ساغرِ دل کی کشمکش خالی سبو کے نام تھی
تیری نگاہ کیا اٹھی محفل کو جام کر دیا

جلوہ گہہ نیاز میں لوگ تھے کتنے جاں بلب
دل میں اترتے ہی یہ کیوں قصہ تمام کر دیا

جب سے حریمِ ذات میں بیٹھا ہوں منتظر ترا
تب سے کوئی بھی رابطہ میں نے حرام کر دیا

دامِ ہوس میں آ گیا ایرجؔ سادہ دل بھی آج
تم نے تو بات بھی نہ کی نظروں نے کام کر دیا

غزل

گوتم سے تھا پہلے جو شری رام سے پہلے
واقف تھا اس سے کون کسی نام سے پہلے

ہر انگ پسینے میں شرابور تو ہوگا
تھوڑی سی مشقت بھی ہے آرام سے پہلے

یوں چھُوٹ گئی مجھ سے گذرگاہِ شرافت
گھر لوٹ کے آ ہی نہ سکا شام سے پہلے

پنچھی کوئی آئے گا بھٹک کر مری جانب
آنکھوں کو بچھائے ہوئے ہوں دام سے پہلے

ہے جان امانت اِسے لوٹانا پڑا آج
یہ کام پڑا آن ہر ایک کام سے پہلے

ہم سے ہی رہی بردہ فروشوں کی حقیقت
انجام کو پہنچے ہیں وہ انجام سے پہلے

بالیں پہ مرے بیٹھا رہا صلح کبوتر
کہرام مچا، جنگ کے کہرام سے پہلے

وہ کرشن کنہیا کی نفیری کے شُبھ اشلوک
رادھا کیلئے لکش تھے انعام سے پہلے

اے رآج ہے گنہگار مگر عفو کا طالب
لیتا ہے ترا نام ہر ایک نام سے پہلے

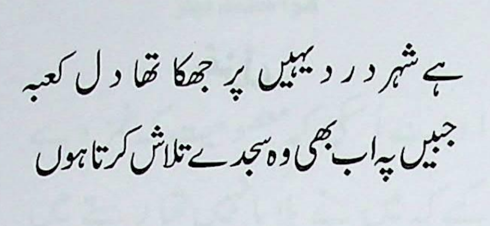
غزل

شکستہ موج ، سفینے تلاش کرتا ہوں
سرابِ خواب جزیرے تلاش کرتا ہوں

جو پاش پاش ہوئے آ لگے کناروں سے
اُن آشناؤں کے چہرے تلاش کرتا ہوں

لکھی ہوئی ہیں کبھی ان کی ڈگریوں پہ نہ جا
ہیں خالی سیپ ، میں ہیرے تلاش کرتا ہوں

ہو جھیل ، چاہے ہو چشمہ کہ تال ، سب بیکار
میں کوہساروں میں سُوتے تلاش کرتا ہوں



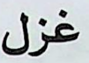
ہے شہر درد یہیں پر جھکا تھا دل کعبہ
جبیں پہ اب بھی وہ سجدے تلاش کرتا ہوں

سنا کے سب کو گیا داستانِ پارینہ
جو میرے تھے میں وہ قصے تلاش کرتا ہوں

نہ لفظ لفظ حقیقت نہ حرف حرف کتھا
میں ہست و بود کے صفحے تلاش کرتا ہوں

نہ تیرا جور و ستم اور نہ میری مجبوری
میں بیچ دونوں کے رشتے تلاش کرتا ہوں

کتابِ دل کے پنے ان میں رکھ سکوں ایرجؔ
میں اپنے بچوں کے بستے تلاش کرتا ہوں



چراغ کوئی جلایا نہیں تھا رستے میں
یہ جال ہم نے بچھایا نہیں تھا رستے میں

میں جس کو مارنے نکلوں وہ کیسے بچ پائے
قسم خدا کی وہ آیا نہیں تھا رستے میں

وہ جس کے بارے میں اخبار روز لکھتے ہیں
وہ زخم اُس نے دکھایا نہیں تھا رستے میں

عجیب شخص تھا بدنام کر گیا مجھ کو
کسی نے اُس کو ستایا نہیں تھا رستے میں

ہوا دشت دیار

ادا ہے اُسکی کہ معصومیت کہ غمزہ ہے
کہے کہ میں نے بلایا نہیں تھا رستے میں

وہاں تو قیس تھا فرہاد بھی تھا رانجھا بھی
مجھے تو کوئی بھی بھایا نہیں تھا رستے میں

اسی محلے اسی گھر میں زیست گذری مگر
کوئی بھی اپنا پرایا نہیں تھا رستے میں

مجھے یہ شہر کوئی چھاونی لگا تھا مگر
کسی نے مجھ کو ڈرایا نہیں تھا رستے میں

میں چاندنی میں انہیں ڈھونڈتا رہا ایرجؔ
میں خود تو تھا، مرا سایا نہیں تھا رستے میں

غزل

یہی تنفس ، یہی تشخص ، بِنا یہی ہے کہانی کی
میں نے بلائیں لے ڈالی ہیں اپنے دشمنِ جانی کی

اب کس پر وہ وار کرے گا کس پہ نشانہ سادھے گا
ڈھاکر میرے دل کی دنیا اس نے بڑی نادانی کی

اب کے موسم لے آیا تھا سوکھا ، بھوکمپ ، غم افلاس
اپنی اپنی خیر منائی سب نے نقل مکانی کی

فصل کے پک جاتے ہی اب کے ٹوٹ گیا ہے دل کا باندھ
کچھ تم نے بے داد کیا کچھ میں نے نافرمانی کی

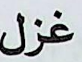
چٹکی بھر سندور سے اس نے آج ہی اپنی مانگ بھری
گیلے ہاتھ حنا سے دکھا کر اس نے آنا کانی کی

کب! کس لمحے! کیا ہو جائے اس کا کچھ تو گیان رہے
میں نے اپنی بات گنوائی تھوڑی سی من مانی کی

شہر میں سب کچھ لٹوا کر ہم آخر گاؤں ہی لوٹ آئے
بات نہ تھی بے گھر ہونے کی بات تھی دانہ پانی کی

کھیت ہرے تھے، پیڑ بھرے تھے، پھر رم جھم برسات ہوئی
سب کچھ ڈوب گیا پانی میں سب کو ضرورت پانی کی

اس کا پھول بدن چھونے سے ہی مجھ میں تحلیل ہوئی
آنچ ابھرتے چاند کی ایرج خوشبو رات کی رانی کی



خلاء بستی زمیں کیا! آسماں تک
یقیں کی سرحدیں پھیلیں گماں تک

میں اپنی ذات کے امکان میں ہوں
شنیدہ، ناشنیدہ لامکاں تک

افق کے پار کش میری نظر کا
ترے تیروں میں گنجائش کہاں تک

کہاں ہو لفظ کی تفسیر کوئی
کہاں اک حرف پہنچا داستاں تک

نفاست رنگ، تتلی پھول، خواہش
سفر اندر سفر دیوارِ جاں تک

مری باتوں کی شیرینی میں سب گم
تیرے لفظوں کے نشتر این وآں تک

غضب ! میں بھی سرابوں کا مسافر
عجب ! میں آ گیا خود ہی یہاں تک

تجسُس ! زندگانی کی علامت
تعقُل ! حادثے کے امتحاں تک

میں سمتوں میں سمٹ جاؤں گا ایرؔج
مری تجدید ہو ممکن کہاں تک

غزل

ہوا و جود سہی میں ٹھہر بھی سکتا ہوں
گلاب رت کی مہک سے نکھر بھی سکتا ہوں

نہ چھُو کے دیکھنا مجھ کو میں کاغذی کیڑا
تمہارے ہاتھ لگانے سے مر بھی سکتا ہوں

بچائے رکھنا مجھے وقت کی ہواؤں سے
کہ مشتِ خاک ہوں دیکھو بکھر بھی سکتا ہوں

پھر آج فصلِ ہوس شوقِ گُل نشینی میں
میں شاخ شاخ صنوبر کتر بھی سکتا ہوں

بگڑ گیا ہوں ، یہ مانا مگر یقیں ہے مجھے
تُو ہاتھ اُٹھا کے دعا دے سنور بھی سکتا ہوں

کرشمہ ! پھول سراپا، طلسم ! خار صفت
تمہارے دل میں کسی دن اُتر بھی سکتا ہوں

مجھے نہ یاد دلا نا کھنڈر کھنڈر ماضی
گذشتہ کل کے تصور سے ڈر بھی سکتا ہوں

کہے تو اپنے لہو ہی کے پھاہے سے
میں دل کے زخم تیرے بھر بھی سکتا ہوں

میں سوچتا بھی نہ تھا اس طرح کبھی ایرجؔ
بدن سراب سفر سے گذر بھی سکتا ہوں

غزل

شعلہ شعلہ صنوبروں میں اُتار
تب مجھے سوکھے جنگلوں میں اُتار

یا سمندر اُتار دے مجھ میں
یا مجھی کو سمندروں میں اُتار

آئینہ آئینہ ہے دستِ سوال
کوئی چہرہ تو آئینوں میں اُتار

کیا کرونگا میں میٹھی دُھن سُنکر
درد کی چیخ بھر سروں میں اُتار

سرفروشوں نہ جاں نثاروں میں
میرے رب! مجھ کو بزدلوں میں اُتار

جو کرم کے ہُنر سے ہوں واقف
اب کے ایسے ستمگروں میں اُتار

پھر سے کر تو وہی بھوش وانی
پھر سے تو مجھ کو پاگلوں میں اتار

سوچ پتھر، حواس آئینے
کچھ نئے واہمے دلوں میں اُتار

حرف پیکر تراش کر ایرؔج
لفظ خنجر عبارتوں میں اُتار

غزل

پہلے یہ بادبان جلانے کی بات کر
پھر ساحلوں پہ مجھ کو بسانے کی بات کر

تو بھی بدل دے آج ہی گرگٹ کے مثل رنگ
آنے کی بات ہو تو نہ آنے کی بات کر

کس درجہ بے بساط ہیں ماضی کی دھڑکنیں
زندوں میں ہے تو اگلے زمانے کی بات کر

پہلے تو راستے میں کچھ انمول جال پھینک
پھر مجھ کو اپنے دام میں لانے کی بات کر

تو نے یہ کام کر دیا دورِ مسیح سے قبل
پھر ایک بار مجھ کو جلانے کی بات کر

یا اپنے آپ سے ہی کوئی گھات کر لے تو
یا مجھ کو انگلیوں پہ نچانے کی بات کر

جینا ہے چند روز تو اچھا ہے ہنس کے جی
رونے کی بات کر نہ رُلانے کی بات کر

ممکن یہی ہے ہم کو ملے اذنِ سفر آج
رہوارِ زیست اگلے ٹھکانے کی بات کر

ایرؔج کہیں نہ آئینہ تجھ سے کرے سوال
تو عکس عکس زخم چھپانے کی بات کر

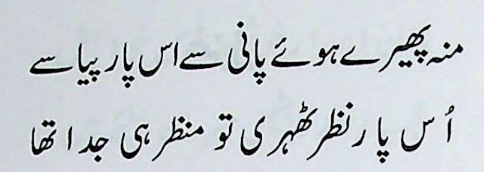
غزل

ہیروں کا فسوں چُن کے ترا جسم ڈھلا تھا
شعلہ تھا مگر کانچ کے برتن میں رکھا تھا

منصف تھا تو انصاف کی کیوں دیتا دُہائی
قاتل تھا تو کیوں ہنس کے سردار گیا تھا

وہ آئے یہ محسوس ہوا کوئی تو آیا
اس طرح بھلا ہم سے کہاں کوئی ملا تھا

بِکنے کے لئے یوسف کنعاں بھی تھے لیکن
میں تیری اداؤں کا خریدار ہوا تھا



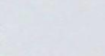
منہ پھیرے ہوئے پانی سے اس پار پیاسے
اُس پار نظر ٹھہری تو منظر ہی جدا تھا

خوشبو کی طرح لمس تمہارا نہ بکھر جائے
اس شدتِ احساس نے چھونے نہ دیا تھا

جاتے ہوئے موسم نے کیا مجھ سے بڑا چھل
میرے ہی لئے فصلِ جدائی کو چنا تھا

گلنار شفق، آگ بدن، چاند بداماں
رنگوں میں اُبھرنے کو تجھے کس نے کہا تھا

یہ کس کا تصور تھا بہت رات گئے آج
ایرؔج سرِ بازار کئی بار مڑا تھا



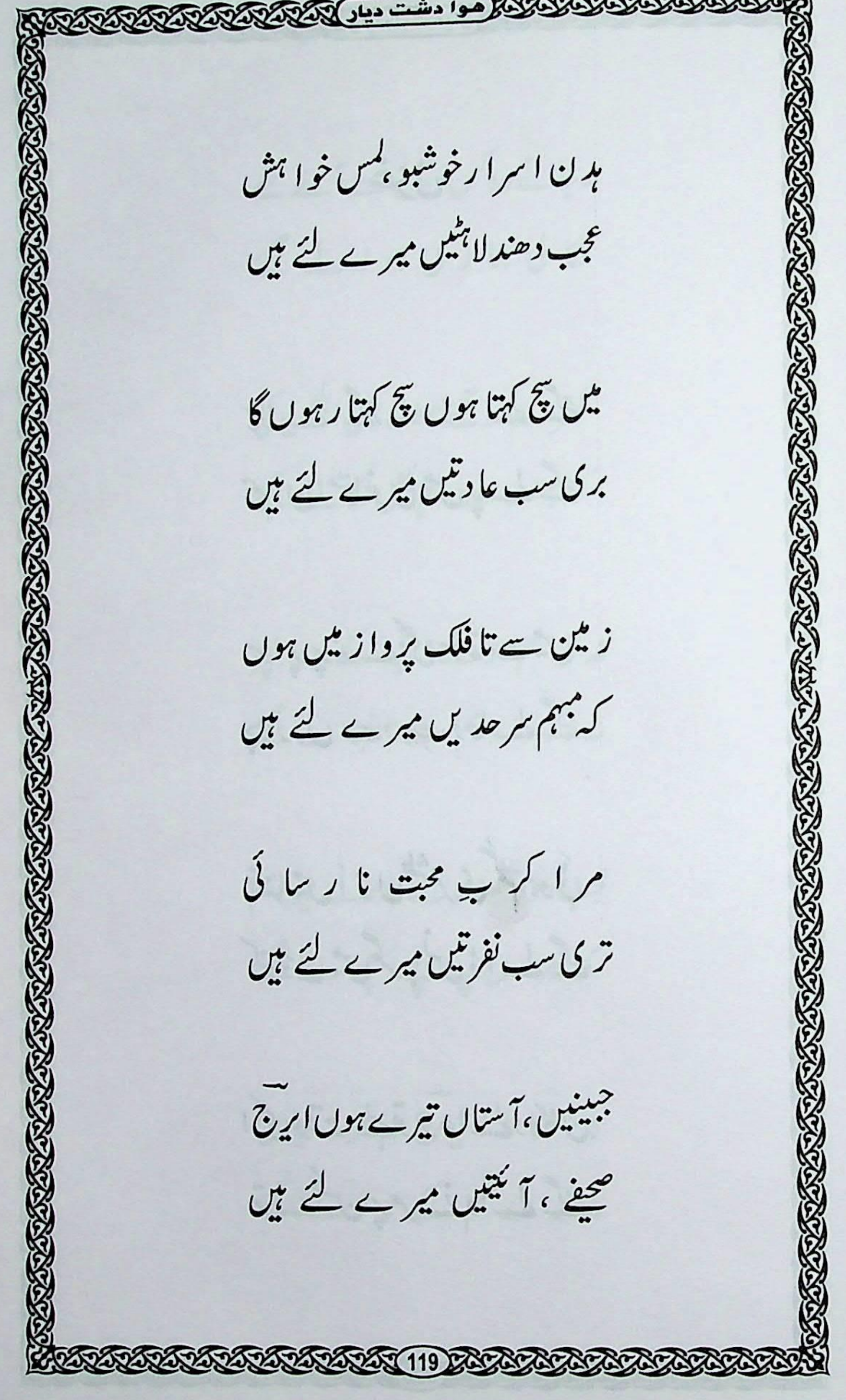
غزل

سفر کی کلفتیں میرے لئے ہیں
یہ کیسی منزلیں میرے لئے ہیں

نہ لب امکاں ۔ نہ آنکھیں استعارہ
نہ منظر خواہشیں میرے لئے ہیں

سلیقے ، سادگی ، اُن کا مقدر
یہ کل یگ ساعتیں میرے لئے ہیں

سحر دشمن ، فسردہ ، شب گزیدہ
سیہ رُو صورتیں میرے لئے ہیں



بدن اسرار خوشبو، لمس خواہش
عجب دھندلاہٹیں میرے لئے ہیں

میں سچ کہتا ہوں سچ کہتا رہوں گا
بری سب عادتیں میرے لئے ہیں

زمین سے تا فلک پرواز میں ہوں
کہ مبہم سرحدیں میرے لئے ہیں

مرا کربِ محبت نارسائی
تری سب نفرتیں میرے لئے ہیں

جبینیں، آستاں تیرے ہوں ایرجؔ
صحیفے، آئتیں میرے لئے ہیں

غزل

جلائے گئے مار ڈالے گئے
ہم ان امتحانوں میں پالے گئے

ہوا پر پرندے بھی سوغات میں
چناروں سے دستِ دعا لے گئے

فضا میں اُڑن طشتری گم ہوئی
کنوؤں میں مگر بانس ڈالے گئے

ابھی وقت ہے تو بڑھا لے دوکان
ترے حُسن پر مرنے والے گئے

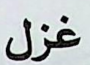
نہ جانے وہ کس دیس سے آئے تھے
نکالی ہماری ہوا لے گئے

کھڑے ہو گئے صف میں ابلیس کی
کہ جنت سے ہم بھی نکالے گئے

نہ ہی ہم ہوئے اب کے سینہ سپر
نہ وہ وار ہم سے سنبھالے گئے

عجب دورِ ظلمت سے گذرے ہیں ہم
کہ نیزوں پہ بچے اُچھالے گئے

نہ الفاظ ایرج نہ طرز بیاں
ہمارے قلم کے حوالے گئے



جس شفق چہرے پہ آئینے کُھلے
کب، کہاں؟ کس کو خبر ہم سے کُھلے

لوٹ آئی ہیں ابابیلیں یہاں
دل دریچے، سوچ دروازے کُھلے

آنکھ مینا، لب کنول، چہرہ گلاب
اُن کو دیکھا حسن سے پردے کُھلے

تم کو آنا تھا نہ آئے، دیر تک
شہر میں تھے سب پری خانے کُھلے

کیا نہ تھیں، کیا کیا نہ تھیں مجبوریاں
ہم قفس میں اور وہ سب تھے کُھلے

میری جانب آئے پتھر طنز کے
مکتبی بچوں کے پھر بستے کُھلے

چار سو پھیلی خرد خوشبو تمام
موسمِ گُل میں تھے دیوانے کُھلے

اب بھی تازہ ہیں تری یادوں کے زخم
ایک مدت ہو گئی ٹانکے کُھلے

حال ایرجؔ ہے یہی ہر شہر کا
ہیں مقفل آدمی کُتے کُھلے

غزل

ہر اک پل زندگی دشوار کرنا
وہ کیا جانے کسی سے پیار کرنا

یہ کوئی لکشمن ریکھا نہیں ہے
مری دہلیز جب تب پار کرنا

مچل اٹھیں اگر جذبات سارے
تو اپنے آپ پر بھی وار کرنا

وہی پت جھڑ وہی قاتل ہوائیں
ذرا پھر دعوتِ افکار کرنا

نہایت تندُ خو ہیں بیتی یادیں
تو پھر کیوں شکوہ اغیار کرنا

مُعین ابتداء بھی انتہا بھی
عبث تقدیر سے تکرار کرنا

بھری محفل میں اُسنے جھوٹ بولا
مرے بس میں نہیں اقرار کرنا

بڑی تیرہ ہے صبحِ زندگانی
الٰہی شام خوش آثار کرنا

نہ مجرم ہے نہ فردِ جرم ایرجؔ
تو ہر اک بات سے انکار کرنا

غزل

میری بستی میں بھی آ کر دیکھتے
حشر سے پہلے ہی محشر دیکھتے

سب کے ہاتھوں میں کھلونے موت کے
سب کی آنکھوں میں یہی ڈر دیکھتے

اپنی اپنی سوچ تھی افکار تھے
تم ذرا ان سب کو پڑھ کر دیکھتے

ہم بھی دے پاتے اگر سورج کا ساتھ
ہم بھی دن ڈھلنے کا منظر دیکھتے

عام لوگوں سے سدا ملتے رہے
کس طرح رہتے ہیں افسردیکھتے

کوئی سایہ ہے نہ کوئی روشنی
تیرگی دیوار و در پر دیکھتے

ہے شکست وریخت ہر شئے کا مآل
جو ہے برتر وہ ہے کمتر دیکھتے

تم نے چومے ہیں حسیں چہروں کے پھول
آستینوں میں بھی خنجر دیکھتے

ریت میں اے آج چھپاتے منہ نہ تم
موت کب آتی ہے سر پر دیکھتے

غزل

بات ایقاں سے گماں سے ہے
کچھ کچھ زورِ بیاں سے ہے

میرے شہر کا روپ سوروپ
اب نہ مکیں نہ مکاں سے ہے

میرا تیر نشانے پر
اوپر پھیلی کماں سے ہے

میں ہر سانس کا قیدی ہوں
رشتہ جسم و جاں سے ہے

سود سے کیا لینا دینا
اپنا کام زیاں سے ہے

رگ رگ میں اترا ہے چاند
سب کچھ میری ہاں سے ہے

پریم نگر سے لوٹ آؤ
جھوجھنا نفرت داں سے ہے

کوئی سخنور مجھ سے بُرا
خارج یہ امکاں سے ہے

آج لفظ و خیال کی جیت
سوچ کے آتش داں سے ہے

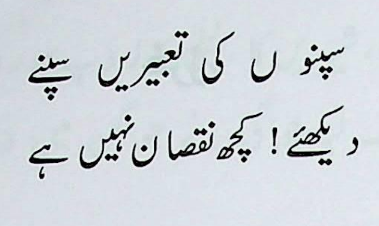
غزل

میری بات میں جان نہیں ہے
یا مجھ پر ترا دھیان نہیں ہے

سیس جھکانے سے کیا حاصل
دیوی کا وردان نہیں ہے

عقدہ کھولنے بیٹھا لیکن
شبدوں کی پہچان نہیں ہے

عشق میں، آج کے قیس اور رانجھے
مر جائیں ! آسان نہیں ہے



سپنوں کی تعبیریں سپنے
دیکھئے! کچھ نقصان نہیں ہے

سب سڑکیں ہیں سُونی سُونی
کوئی گلی سنسان نہیں ہے

میرے لئے خیرات بھی مانگی
کہتا ہے دھنوان نہیں ہے

سستے میں ملتا تھا کل تک
آج کا عاشق دان نہیں ہے

میں بھی کہاں سنتشٹ ہوں ایرجؔ
تُو بھی دِرشٹاوان نہیں ہے

غزل

چا ند نگر میں ڈھونڈا آنگن میں دیکھا
اُن کو پایا جب دل درپن میں دیکھا

میرے لئے زیادہ تر موسم انجانے
اپنا پن دیکھا تو ساون میں دیکھا

دیکھے تھے سپنے ہم نے گلیاروں میں
شہر آئے تو سب کچھ انسون میں دیکھا

چُھٹ پُٹ بات کروں میں کیا اس بارے میں
آنکھ کُھلی تو خود کو ہی رن میں دیکھا

ہیر کا، شیریں کا، لیلیٰ کا رُوپ سوروپ
جوگ لیا جوگی نے جوگن میں دیکھا

شام سے پہلے لوٹنے والے پنچھی کو
چونچ کھجاتے شاخ پہ الجھن میں دیکھا

جس تن لاگا سو تن جانے! سچ ہے تو؟
کس تن لاگا میں نے ہر تن میں دیکھا

ان کے لئے کیا کر پائے ہم مردہ لوگ
خون شہیدوں کا ہر دھڑکن میں دیکھا

درد نہ میٹھے بول نہ ہی ترتیب حروف
حُسن کہاں ایرؔج تیرے فن میں دیکھا

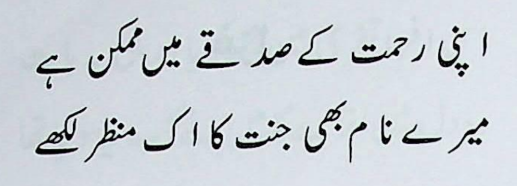


پہلے میرا حصہ سات سمندر لکھے
اُس کے بعد میری قسمت میں پتھر لکھے

لکھنے کی سب چیزیں خدمت میں رکھ دیں
جانے کس خامے سے میرا مقدر لکھے

اک پل مجھ کو چاند مسافر بولے گا
دوسرے لمحے میں ہی سانپ صنوبر لکھے

فون کیا ہے اور نہ ہی بھیجا ای۔میل
شاید خط میں پیار کا سارا دفتر لکھے



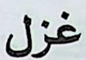
اپنی رحمت کے صدقے میں ممکن ہے
میرے نام بھی جنت کا اک منظر لکھے

خلق کیا تو، بھاگِ ودھاتا کی مرضی
میرے بھاگ میں مسجد چاہے مندر لکھے

حال ہماری تحریروں کا پھر کیا ہو
پتھر کی تقدیر اگر ہر آزر لکھے

ہر سُو آگ، دھواں، لاشیں بارود کی بو
دل روداد سخنور کوئی کیوں کر لکھے

اب تو بہت آسان ہے ایرجؔ چُپ رہنا
اب تو پیں گاتی ہیں بول ستمگر لکھے



غزل

زہرہ جبینوں سے میرا بھی آنکھ مٹکا تھا
یہ جب کا واقعہ ہے جب میں اُن میں رہتا تھا

اس کے پاؤں کی آہٹ میں تھی ویسی جھنکار
دل مندر کے دوار کا جیسے گھنٹا بجتا ہے

شب بستر پر چاند کھلونے سے جی بھر کھیلا
دن دروازے میں جب تک خورشید نہ اترا تھا

دھوپ تمازت، شام دھندلکا، رات سمندر آنچ
اس بستی میں آتے مجھ کو ڈر سا لگتا ہے

اس افراتفری میں مجھ کو یاد رہی یہ بات
وہ دل میں اترے گا میں نے کب یہ سوچا تھا

عشق عبادت اصل مری میں کر نہ سکا تفریق
جو پیکر جو بُت دیکھا تھا اس کو پوجا تھا

اب تو خدارا گور میں مجھ کو چین سے رہنے دو
اب یہ جان کے کیا کرلو گے میں سچا تھا یا جھوٹا تھا

ہر پل میری دعاؤں میں تھی سب لوگوں کی خیر
میں نے ہمیشہ سب لوگوں سے رشتہ جوڑا تھا

ایک یہی میثاق تھا اُس میں، اس کی بیوی میں
شام سے پہلے ہی ایرج کو گھر آجانا تھا

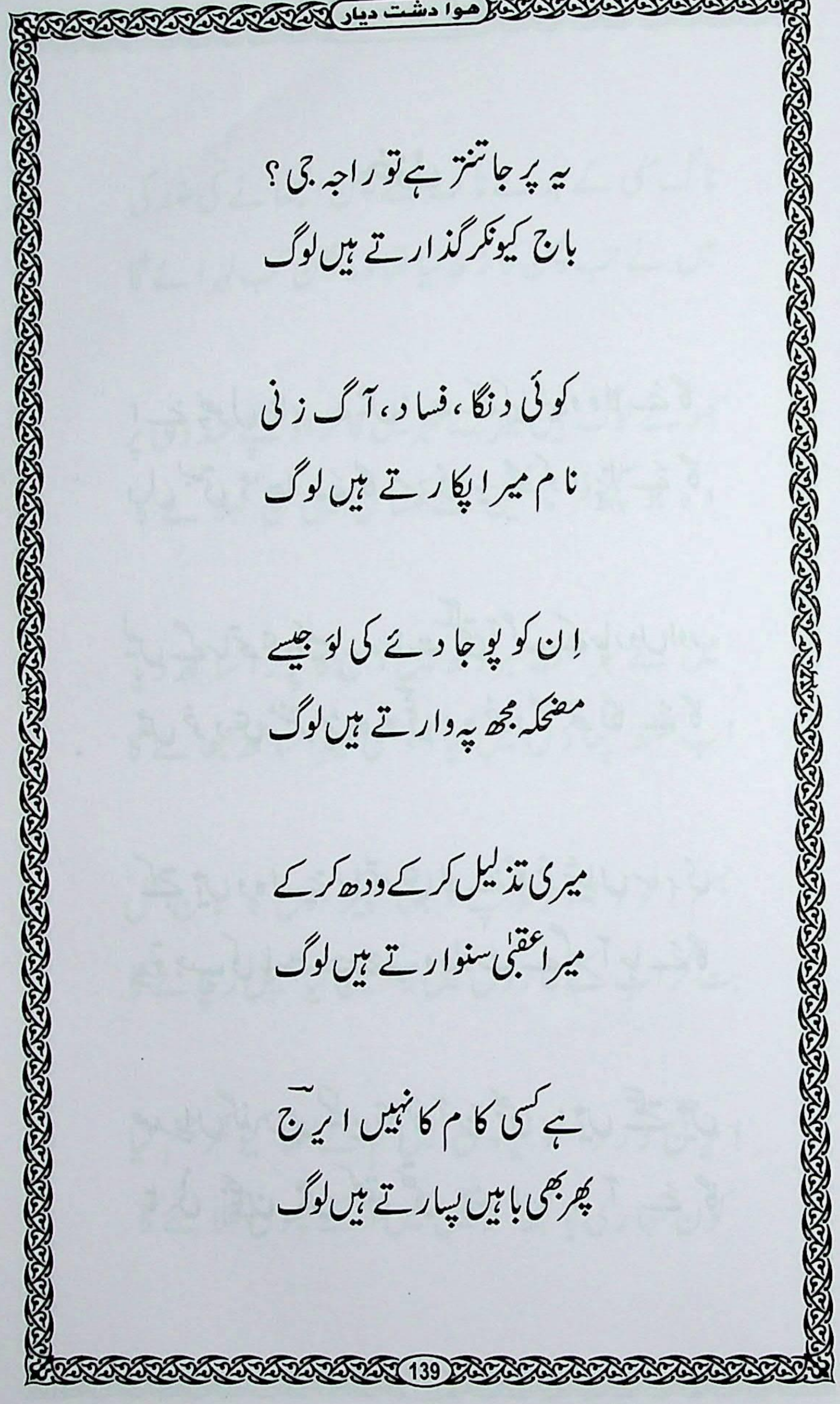
غزل

ایک جھٹکے میں مارتے ہیں لوگ
اسطرح ہی سہارتے ہیں لوگ

اس کو چیٹنگ قرار دیتے ہیں
اپنی بازی جو ہارتے ہیں لوگ

وقت پڑنے پہ دشمن جاں کی
آرتی تک اتارتے ہیں لوگ

حال میرا نہ میرا مستقبل
اپنا ماضی نکھارتے ہیں لوگ



یہ پرجا تنتر ہے تو راجہ جی؟
باج کیونکر گذارتے ہیں لوگ

کوئی دنگا، فساد، آگ زنی
نام میرا پکارتے ہیں لوگ

اِن کو پوجا دئے کی لوَ جیسے
مضحکہ مجھ پہ وارتے ہیں لوگ

میری تذلیل کر کے ودھ کر کے
میرا عقبیٰ سنوارتے ہیں لوگ

ہے کسی کام کا نہیں ایرج
پھر بھی باہیں پسارتے ہیں لوگ

غزل

اپنے پھول پٹارے میں اب کے کیا کیا وہ لائے گا
دل بستی ڈھائے گا میری یا مجھ کو اپنائے گا

لیں گے ساتھ ہی پھیرے سات سلگتی آگ کے چاروں اور
میں خود ہی منتر پڑھ لونگی وہ خود گانٹھ لگائے گا

کہتے ہیں وہ اپنے ساتھ ہی لائے گا خوشیاں ساری
یہ تو جب کی بات ہے جب وہ لوٹ کے گھر آجائے گا

صدیاں گذریں لیکن ہم تو آج بھی راہیں تکتے ہیں
نانی بچپن میں کہتی تھی چندا ماما آئے گا

ناگ منی کے بدلے ناگ نے پھن الجھانے کی ضد کی
میں نے تب پھن کاڑھ لیا تھا وہ پھن کب لہرائے گا

جھوٹے لوگ ہیں میرے شہر میں فائز اونچے عہدوں پر
وہ جو کچھ فرمائیں گے ٹکسال میں سچ کہلائے گا

میں نے ہر سنکٹ ہر دکھ میں اس کا پورا ساتھ دیا
اب سُکھ چھاؤں میں کیا وہ بھی میرا ساتھ نبھائے گا

جسم الورا، روپ اجنتا پیکر اس کا تاج محل
بت گر اب کے غاروں میں دیکھیں کیا کھیل رچائے گا

اے رجؔ درد سویروں میں تم نے تھا کیونکر جنم لیا
کون تمہاری بانجھ زمیں میں آ کے پھول کھلائے گا

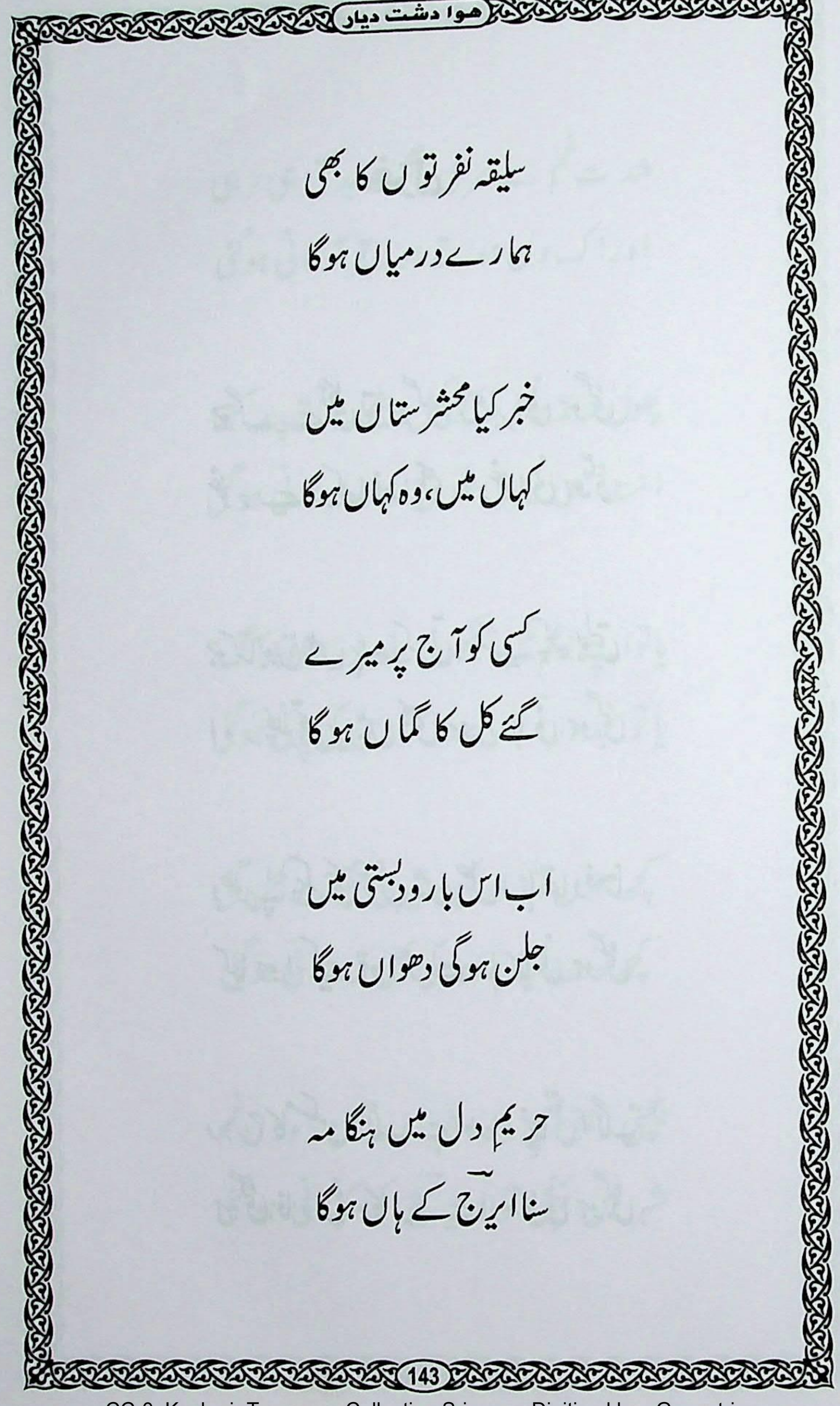
غزل

جو زیبِ داستاں ہوگا
مرا طرزِ بیاں ہوگا

ملن ہو یا جدائی ہو
ہمارا امتحاں ہوگا

جو دکھ دا ایک ہو ظلمی ہو
وہی آرامِ جاں ہوگا

سنا ہے جو نہ دیکھا ہے
زمانہ! مہرباں ہوگا



سلیقہ نفرتوں کا بھی
ہمارے درمیاں ہوگا

خبر کیا محشرستاں میں
کہاں میں، وہ کہاں ہوگا

کسی کو آج پر میرے
گئے کل کا گماں ہوگا

اب اس بارود بستی میں
جلن ہوگی دھواں ہوگا

حریمِ دل میں ہنگامہ
سنا ایرج کے ہاں ہوگا

غزل

جوگ سے نکلی تو جوگن زعفرانی ہوگئی
غور سے دیکھا فضا بھی ارغوانی ہوگئی

جو کتابوں میں پڑھا کرتی وہ سب کچھ بولتی
اور پھر تحریر میں بھی منہ زبانی ہوگئی

دھوپ پیکر کی تپش میں جل رہا تھا دفعتاً
کیا ہوا کیسے ہوا رُت سائبانی ہوگئی

روح کا مسکن الگ ہے اور اونچائی الگ
ہوگئی فارغ مکاں سے لامکانی ہوگئی

شِدتِ غم سے مری رنگت بدلتی ہی رہی
اور اک دن ہوتے ہوتے آسمانی ہوگئی

پھول منہ سے اس کے، کھل اٹھے سناتے پٹ کتھا
انت میں میری طرح وہ داستانی ہوگئی

یا تو اپنے زعم میں آنکھوں سے برساتا تھا آگ
یا تو سجدوں میں سدا آہ اس کی پانی ہوگئی

کچھ جنوں آزار کی، تیری حقیقت کھل گئی
کچھ ترے جذبات کی بھی ترجمانی ہوگئی

پہنچتی رہتی تھی وہ اطراف میں رودادِ غم
شہر میں پہنچی تو ایرج کی کہانی ہوگئی

غزل

اُسے کیا؟ بات کی تھی مسکراتے
ہماری عمر گذری آتے جاتے

مرے الفاظ درپن منتظر ہیں
تم ان میں اپنا چہرہ بھول آتے

یہاں سب کھے رہے ہیں وقت کشتی
جو ہوتا ہاتھ میں میلہ لگاتے

مرا کاسہ نہیں مجنوں کا کشکول
یہ گنجِ بے بہا ہے آزماتے

سبھی اس سین میں شامل رہے ہیں
کسی کو کیا بتاتے کیا چھپاتے

نہیں ہے قعرِ دریا ظرف میرا
سمندر کی عُمق ہے کیا بتاتے

مجھے سونے کے پانی میں بھگو کر
کسی بھی چوک میں ننگا نچاتے

ہے اُس کے ہاتھ میں پتھر نہ بھالا
بھلا کیوں لوگ ہیں اس پر غراتے

تری نیّت سمجھتے کاش ایرجؔ
نہ خود لٹتے نہ دل دامن جلاتے

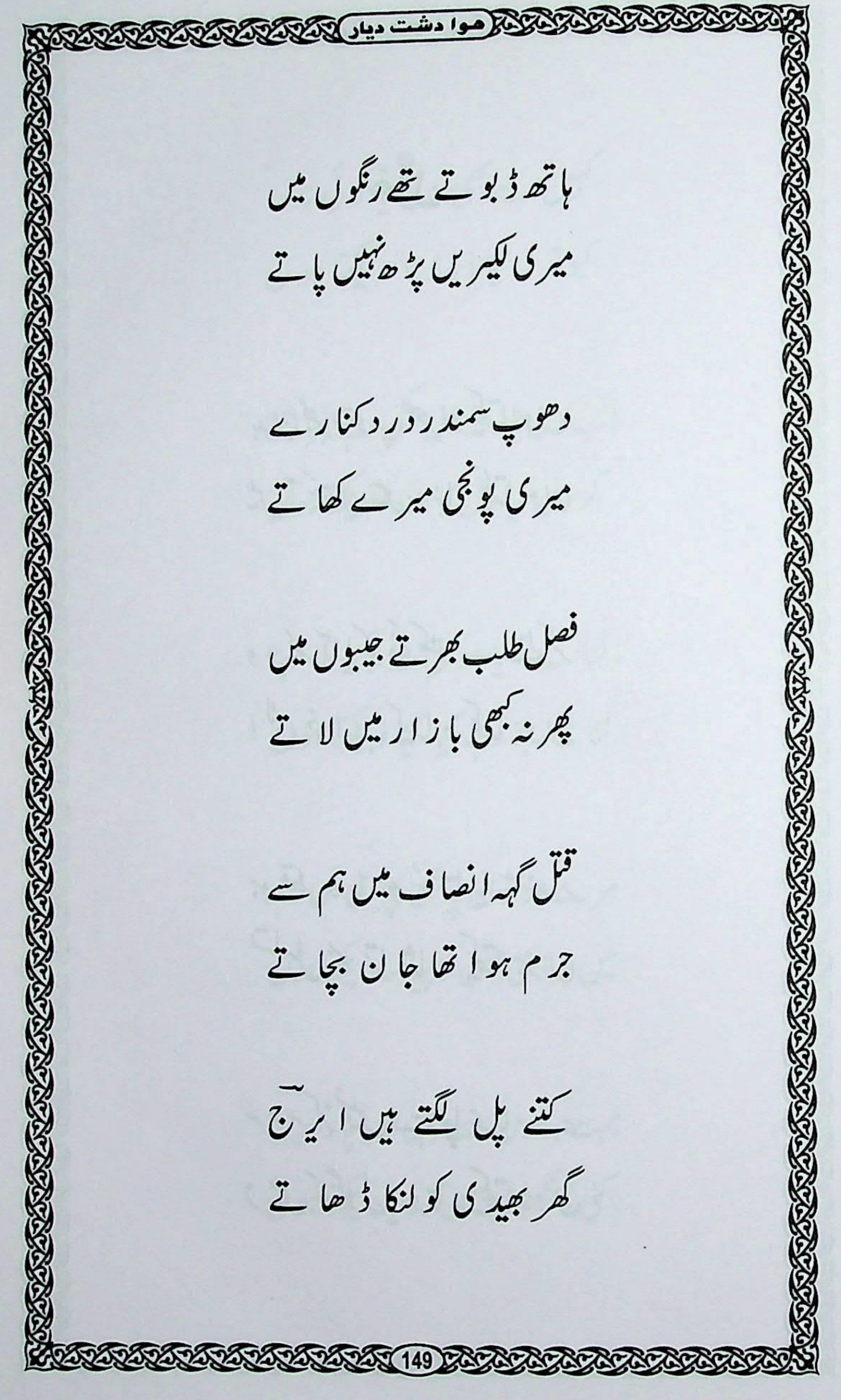
غزل

اتنا کرتے اپنا بناتے
پھر جتنے بھی زخم لگاتے

کس کس کو دیتے دل دولت
جو بھی ملے سب تھے من بھاتے

روٹی چھینی ، پانی کے بھی
قطروں پر وہ پہرہ بٹھاتے

وہ بائی بائی کرتے تو ہم بھی
اپنے ہاتھوں کو لہراتے



ہاتھ ڈبوتے تھے رنگوں میں
میری لکیریں پڑھ نہیں پاتے

دھوپ سمندر درد کنارے
میری پونجی میرے کھاتے

فصل طلب بھرتے جیبوں میں
پھر نہ کبھی بازار میں لاتے

قتل گہہ انصاف میں ہم سے
جرم ہوا تھا جان بچاتے

کتنے پل لگتے ہیں آیرجؔ
گھر بھیدی کو لنکا ڈھاتے

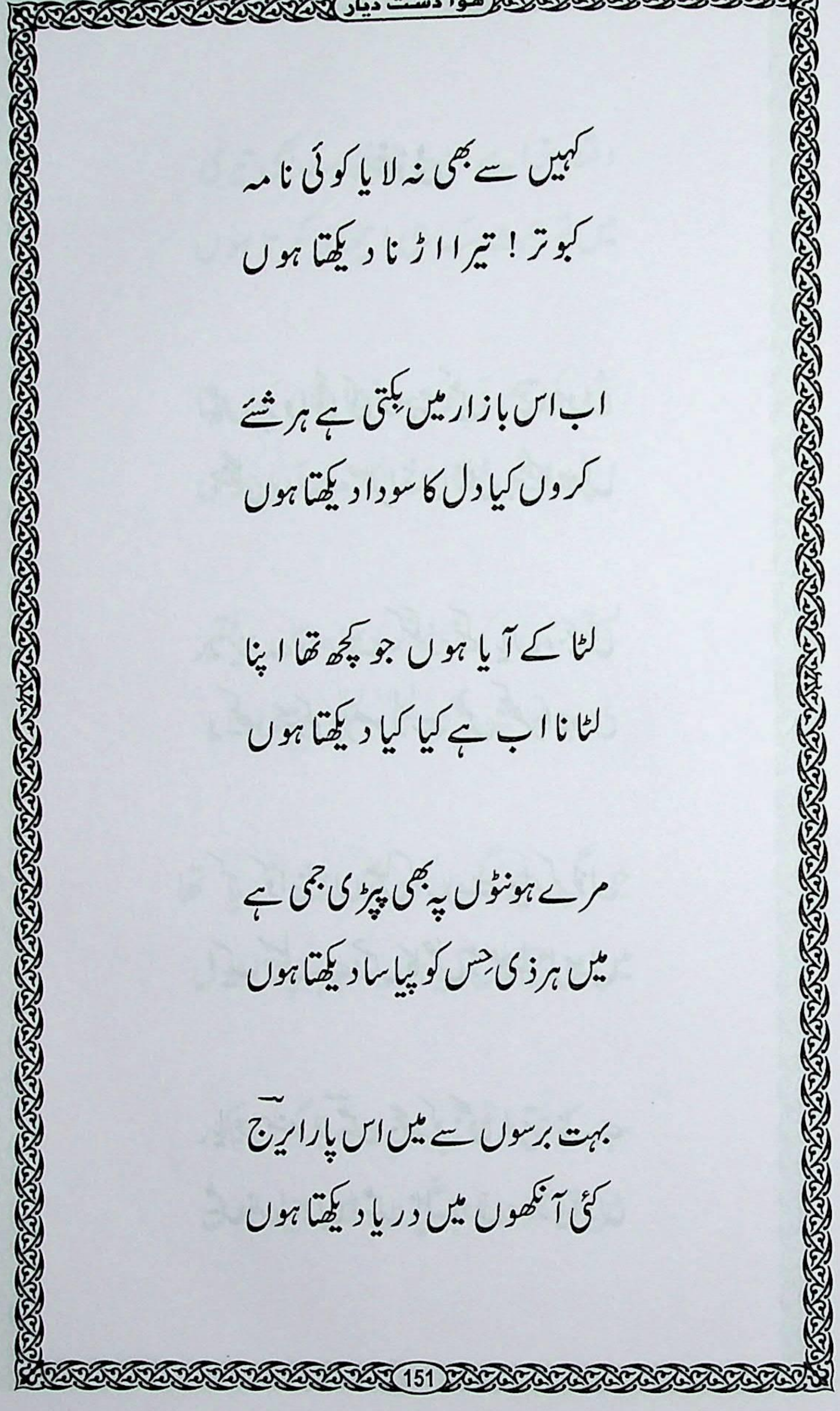
غزل

بدن بھر دھوپ صحرا دیکھتا ہوں
میں آئینوں میں دنیا دیکھتا ہوں

وہ پھر آیا کوئی مکتوب لے کر
الٰہی خواب کیسا دیکھتا ہوں

ہو قطرہ یا ہو سُوتا یا سمندر
تسلسل کا تماشا دیکھتا ہوں

مرا مرکز نہیں ہے چاند تارے
زمیں کو گول ہوتا دیکھتا ہوں



کہیں سے بھی نہ لایا کوئی نامہ
کبوتر! تیرا اڑنا دیکھتا ہوں

اب اس بازار میں بکتی ہے ہر شئے
کروں کیا دل کا سودا دیکھتا ہوں

لٹا کے آیا ہوں جو کچھ تھا اپنا
لٹانا اب ہے کیا کیا دیکھتا ہوں

مرے ہونٹوں پہ بھی پپڑی جمی ہے
میں ہر ذی حِس کو پیاسا دیکھتا ہوں

بہت برسوں سے میں اس پار ایرجؔ
کئی آنکھوں میں دریا دیکھتا ہوں

غزل

میں پروائی کی رچنائیں رچتا ہوں
جنگل، دریا، صحراؤں میں بھٹکا ہوں

ریزے، ذرے، کنکر، ٹیکریاں، بجری
دیکھو مجھ کو ہر صورت میں بکھرا ہوں

کس کو اپناؤں میں کس سے پیار کروں
ایک پہیلی ہے جس کا حل ڈھونڈتا ہوں

یادِ سمندر میں مجھ کو بھی اترنا ہے
میں ندیا ہوں، میں نالہ ہوں، دریا ہوں

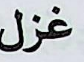
وقت ترا ہے، چِت تیری پٹ بھی تیری
میں تو عبث سِکہ ہی اچھالا کرتا ہوں

شہر کی سم آلودہ فضا میں کیا جیتا
اپنی لاش ٹھکانے لگا کے آیا ہوں

بستی میں اک بنجارہ تھا، میں نہ فقیر
اب تو میں بھی لیلیٰ لیلیٰ جپتا ہوں

جوگی جوگن کو للچانے آیا تھا
میں ہی بیچ میں آیا ہوں، بے پرواہوں

سب کو ہی مرغوب ہے ایرج گول چکور
میں تو تکونے باغیچوں میں بیٹھا ہوں

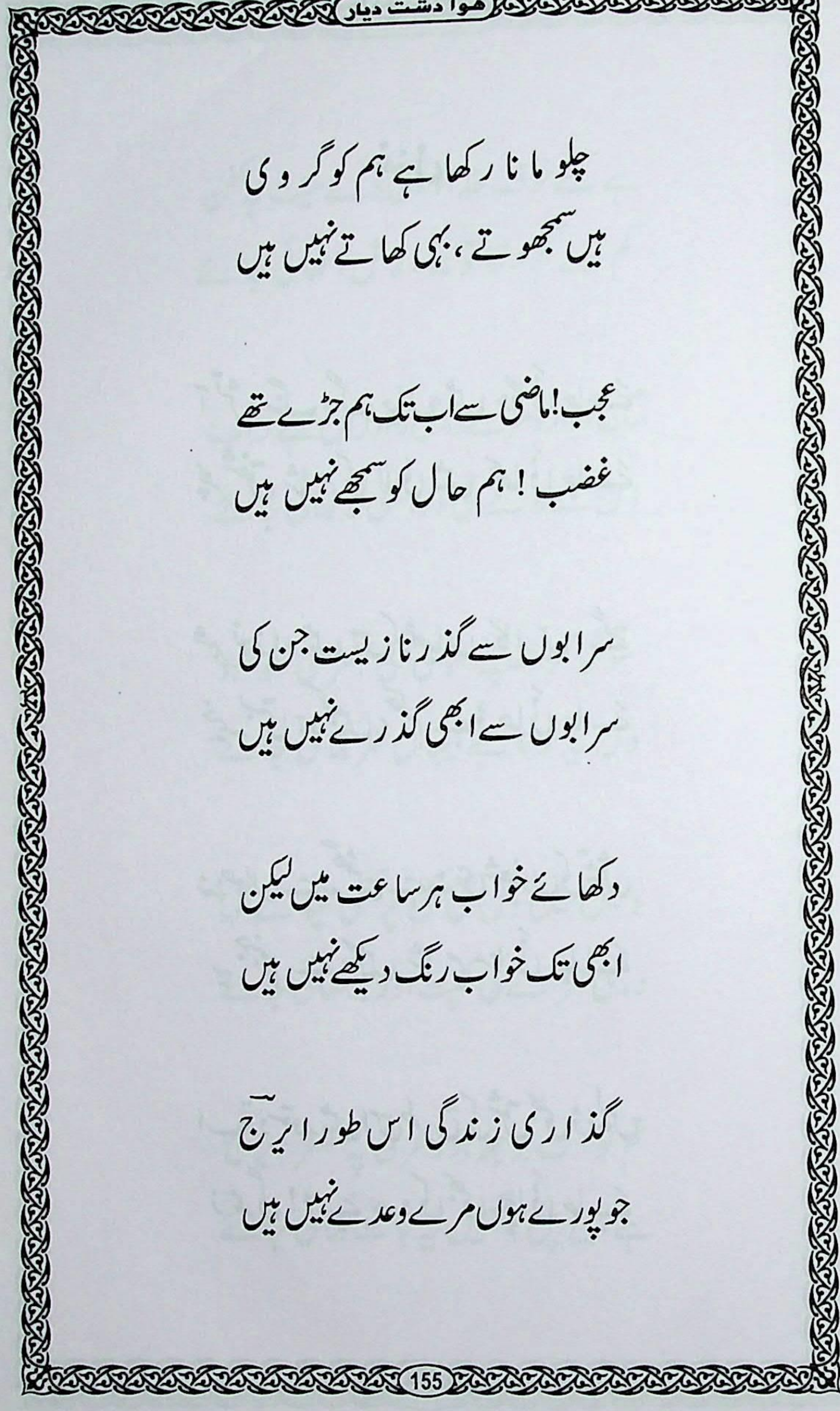


مرے افکار بھی بکتے نہیں ہیں
عجب! ٹکسال میں سکے نہیں ہیں

سجل حالات میرے درد قصے
کتابوں میں ابھی لکھے نہیں ہیں

اکٹھا کر کے پنچھی خار و خاشاک
بنانا آشیاں بھولے نہیں ہیں

صدف باتیں مری الفاظ موتی
بیاں کے سلسلے بیچے نہیں ہیں



چلو مانا رکھا ہے ہم کو گروی
ہیں سمجھوتے، بہی کھاتے نہیں ہیں

عجب! ماضی سے اب تک ہم جڑے تھے
غضب! ہم حال کو سمجھے نہیں ہیں

سرابوں سے گذرنا زیست جن کی
سرابوں سے ابھی گذرے نہیں ہیں

دکھائے خواب ہر ساعت میں لیکن
ابھی تک خواب رنگ دیکھے نہیں ہیں

گذاری زندگی اس طور ایرجؔ
جو پورے ہوں مرے وعدے نہیں ہیں

غزل

آتش سنگ رگِ جاں میں جگائی جائے
پھر شفق شام کی لالی میں بجھائی جائے

شہرِ نوزاد میں ہیں کوٹھیاں، کاریں، کُتّے
خیمہ بستی ہو کہیں، حکم ہے ڈھائی جائے

نہ دھواں ہے نہ گھٹن ہے، نہ ہی شعلوں کی تپش
یہ جہنم ہے یہیں شام منائی جائے

اب تو دستور میں اس طرح کی شق بھی ڈالیں
زندگی! اپنے عدو کی بھی بچائی جائے

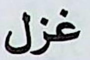
ہے کسے خوفِ خدا ڈال دے میّت پہ کفن
کم سے کم اتنا تو ہو، لاش اٹھائی جائے

سگِ آوارہ مرے دیش کا ارزاں ہے کہ اب
اس کے کاٹے کی دوا بھی نہ بنائی جائے

سونگھ کر قطبِ شمالی کی ٹھرتی خوشبو
دل یہ کرتا ہے یہاں عمر بتائی جائے

دیش میں جل کی کمی پر کسی نیتا نے کہا
دیسی ٹھرّے کی کھپت اور بڑھائی جائے

تم تو اک بوجھ ہو دھرتی پہ مُظفر ایرجؔ
ہے یہی پل، تمہیں یہ بات بتائی جائے



میں تھا تیرا اُجڑ ج در پن مان نہ مان
کہتی تھی مجھے دل کی دھڑکن ، مان نہ مان

تیرے بعد ہر اک موسم ہے آگ الاؤ
تیرے ساتھ ہمیشہ ساون ، مان نہ مان

تو ہی ڈال گلے میں اُس کے گُل مالا
میں کردوں گا جان ہی ارپن ، مان نہ مان

رات کے اُن لمحوں کی عنایت پوجا پاٹھ
بجتی ہے جب پائل چھن چھن ، مان نہ مان

یگ بیتے گوکل میں کرشن کنہیا جی
مجھ کو بھی دیتے تھے درشن ، مان نہ مان

تیرے شہر میں آتی جاتی رہتی ہوں
روز نبھانے کوئی بندھن مان نہ مان

رن میں کہیں جا میرے پاس نہیں آنا
میں تو ہوں اک تیرا دشمن مان نہ مان

تیرے باغ کے آم چرا کر آج بھی میں
زندہ کر لیتا ہوں بچپن ، مان نہ مان

پولو کھیلتے ایرج اور میں ساتھ گرے
ساتوں طبق ہوئے تھے روشن مان نہ مان



غزل

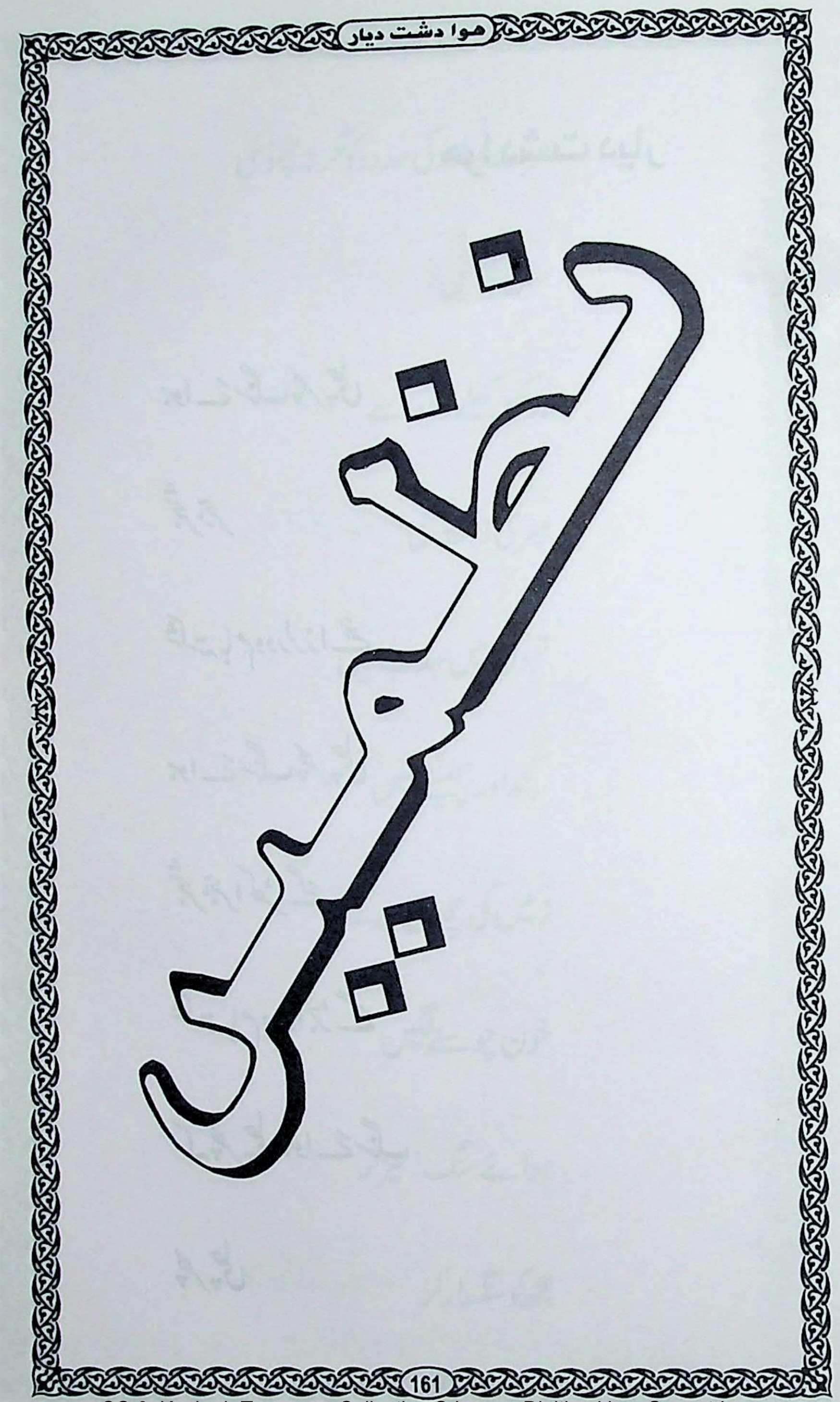
پہلے ادراک کو عرفان شناسا کرتے
پھر بصد شوق مری بات کا چرچا کرتے

ہم تہی فکر نہیں ہیں تو تہی دل بھی نہیں
ہاں تہی دست و گریباں ہیں، وفا کیا کرتے

سامنے دھوپ نہ تھی پچھلی طرف سایہ نہ تھا
سر پہ ٹھہرے ہوئے سورج کو نہ پوجا کرتے

دفن ہے سوچ بھی فرسودہ روایت میں ابھی
آپ کہتے تو ہم اس طرح بھی سوچا کرتے

ہم طلسمات گہہِ عشق میں تنہا ایرجؔ
کس طرح تیرے نہ ہونے کا تماشا کرتے



ھوا دشت دیار

ہوائے سنگ پھر چلی

شجر ہجر

شکستہ بام و در لرز اٹھے

ہوائے سنگ پھر چلی

شجر ہجر اکھڑ گئے

شکستہ بام و در اُجڑ گئے

کہ پھر چلی ہوائے سنگ

پھر چلی

مرے وجود کی حدود کو مگر نہ چھو سکی

مری جڑیں!

جو کھو کھلے خلاء سے

میری ذات کی

تہوں میں جذب ہیں

کچھ اور پھیلنے لگیں

زمیں کی چھاتیوں سے

خون چوسنے لگیں

ہوائے سنگ! تیز تر

مجھ کو سنگسار کر

مجھ کو میرے

اَن کیئے گناہوں کی سزا تو دے

مجھ کو میری

بے گناہیاں بہت عزیز ہیں

میں

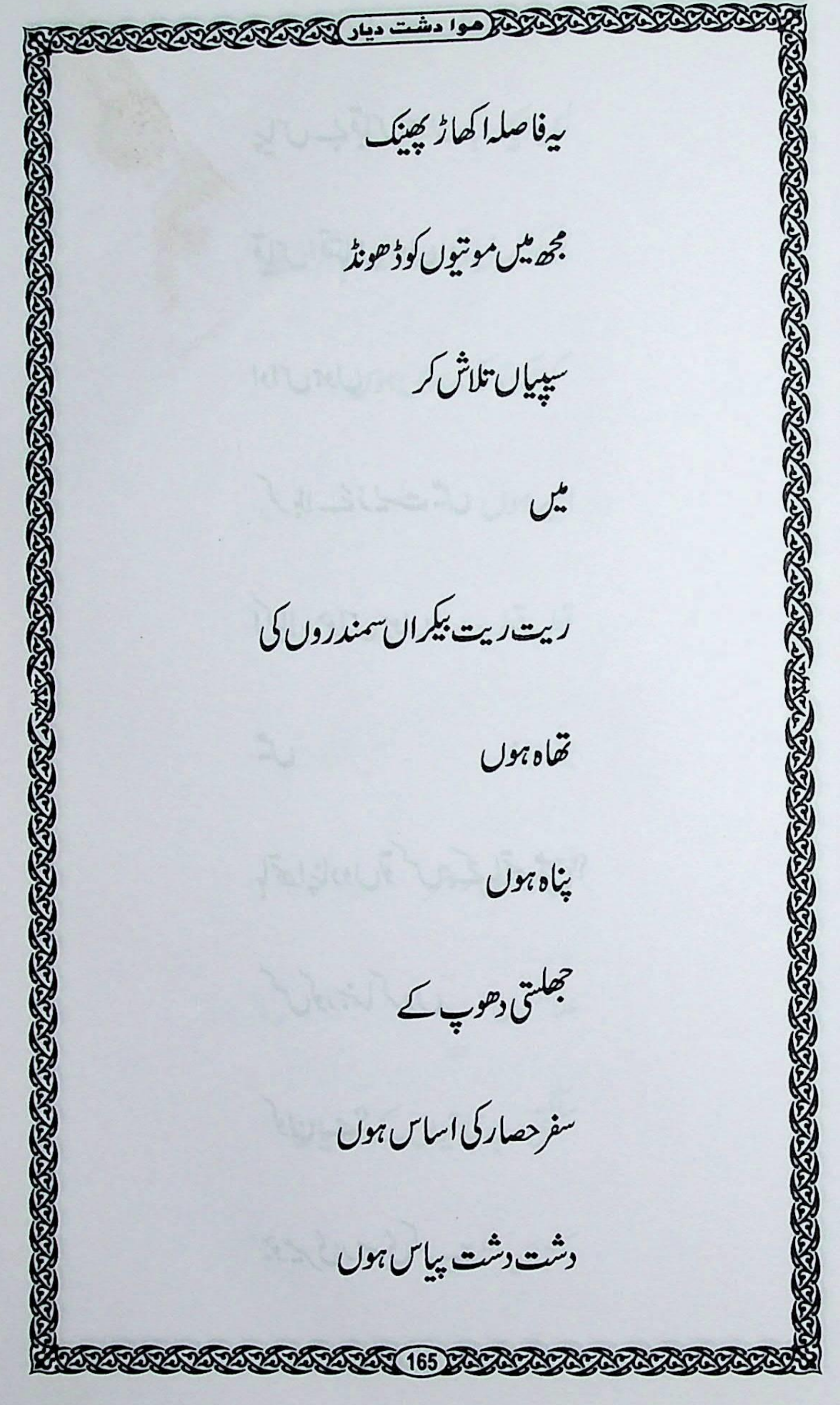
زمہریرِ ذات میں ہی دفن ہوں

ہوائے سنگ!

تیز گام، تیز تر

ہمارے درمیاں ابھی

وجود کا ہے فاصلہ



یہ فاصلہ اکھاڑ پھینک

مجھ میں موتیوں کو ڈھونڈ

سیپیاں تلاش کر

میں

ریت ریت بیکراں سمندروں کی

تھاہ ہوں

پناہ ہوں

جھلستی دھوپ کے

سفر حصار کی اساس ہوں

دشت دشت پیاس ہوں

پیاس بے قیاس ہوں

قیاس اقتباس ہوں

اداس ہوں

کربلائے زیست میں

اکیلا بدحواس ہوں

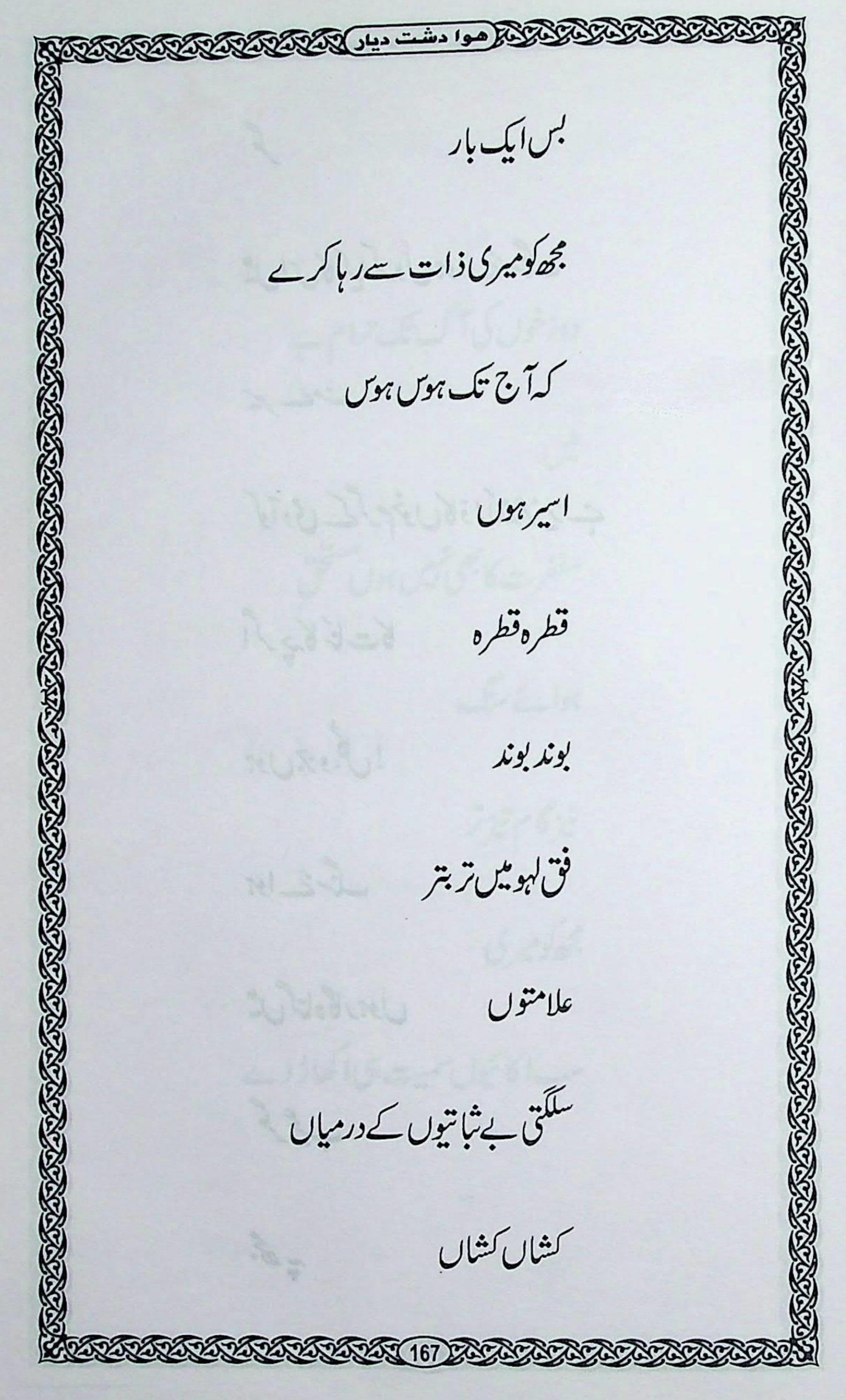
میں

ہاتھ اپنا دوں تو کس کے ہاتھ میں؟

کس کو رہنما کروں

کون ہے؟

جو میری رہبری کرے



بس ایک بار

مجھ کو میری ذات سے رہا کرے

کہ آج تک ہوس ہوس

اسیر ہوں

قطرہ قطرہ

بوند بوند

فق لہو میں تر بتر

علامتوں

سلگتی بے ثباتیوں کے درمیاں

کشاں کشاں

مگر

میں اس کا کیا کروں ہوائے سنگ

میرے منہ

کو آدمی کے گرم خوں کا ذائقہ عزیز ہے

اگرچہ کائنات کا

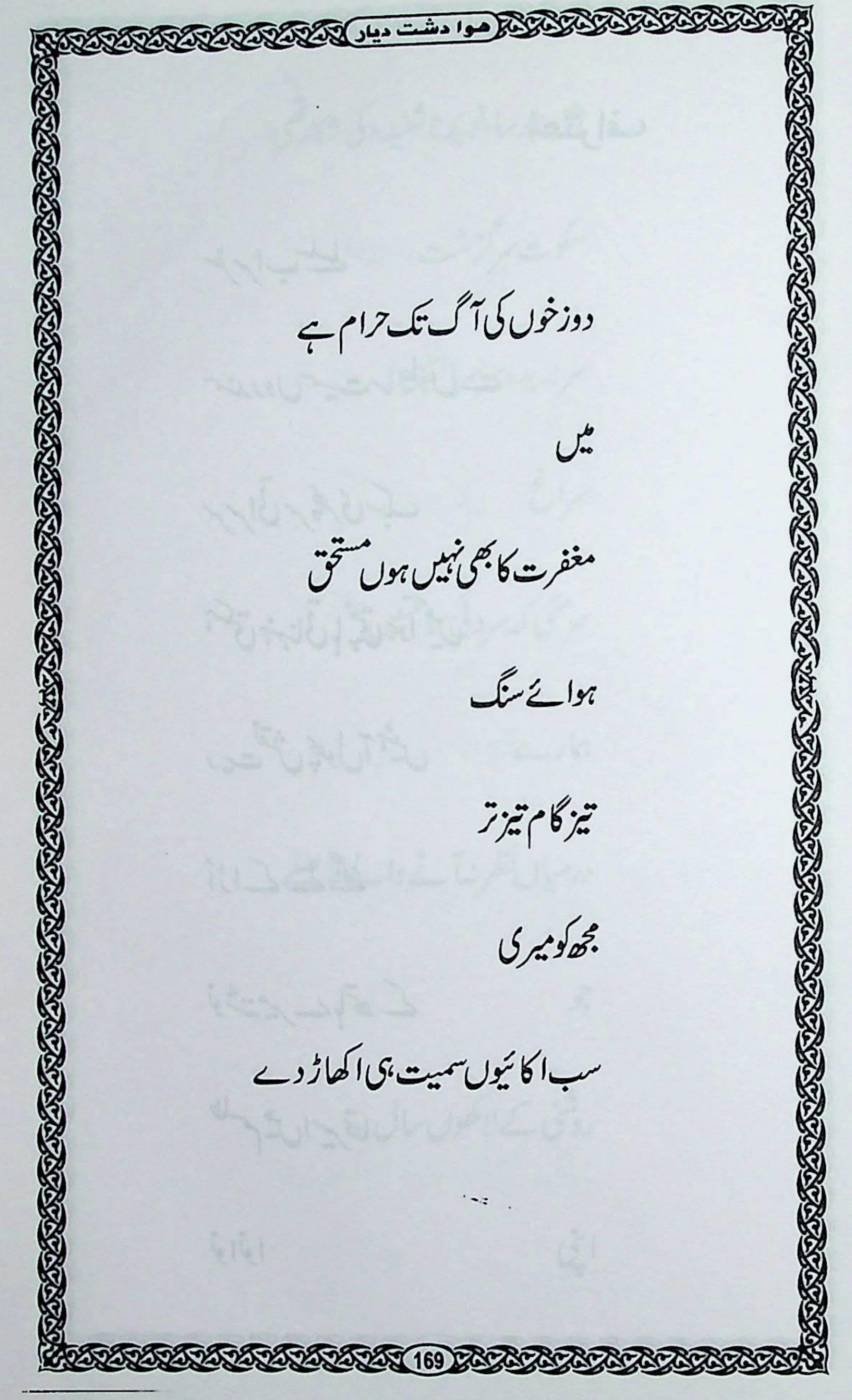
ہوں جُزو، کُل!

ہوائے سنگ

میں گناہ گار ہوں

مگر عجیب

مجھ پہ



دوزخوں کی آگ تک حرام ہے

میں

مغفرت کا بھی نہیں ہوں مستحق

ہوائے سنگ

تیز گام تیز تر

مجھ کو میری

سب اکائیوں سمیت ہی اکھاڑ دے

اعتراف

سفر سراب سلسلے

سمندروں سمیت ساحلوں سے

سرسراتی سرپھری سبک

ہمکتی ہنہناتی ہانپتی ہوائیں

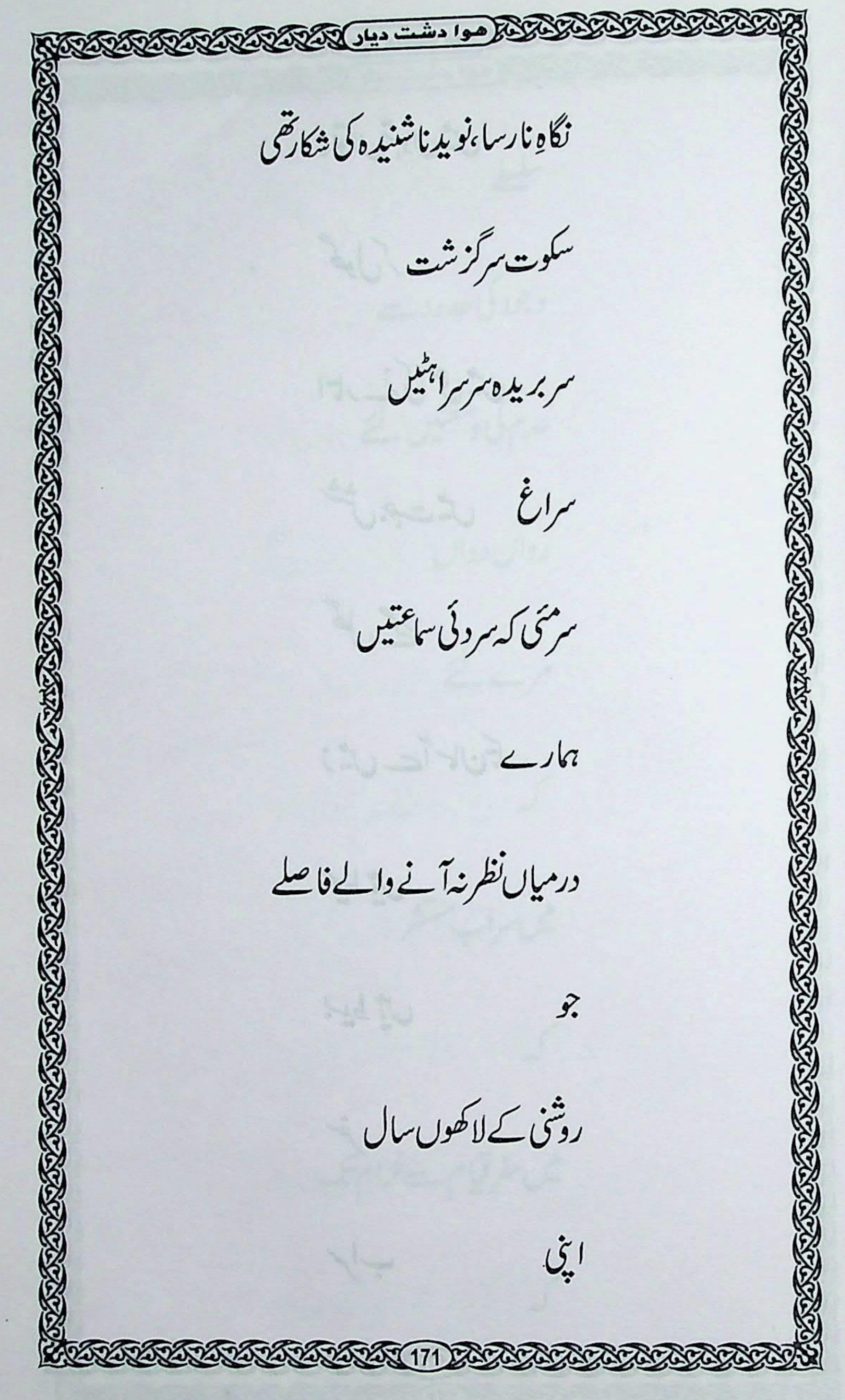
ریت نقش پھول آہٹیں

اُڑا کے لے گئے

نوشتہ میرے ہاتھ کے

طلسم میں اسیر تھا

نوانوا



نگاہِ نارسا، نویدِ ناشنیدہ کی شکار تھی

سکوت سرگزشت

سر بریدہ سرسراہٹیں

سراغ

سرمئی کہ سرد ئی سماعتیں

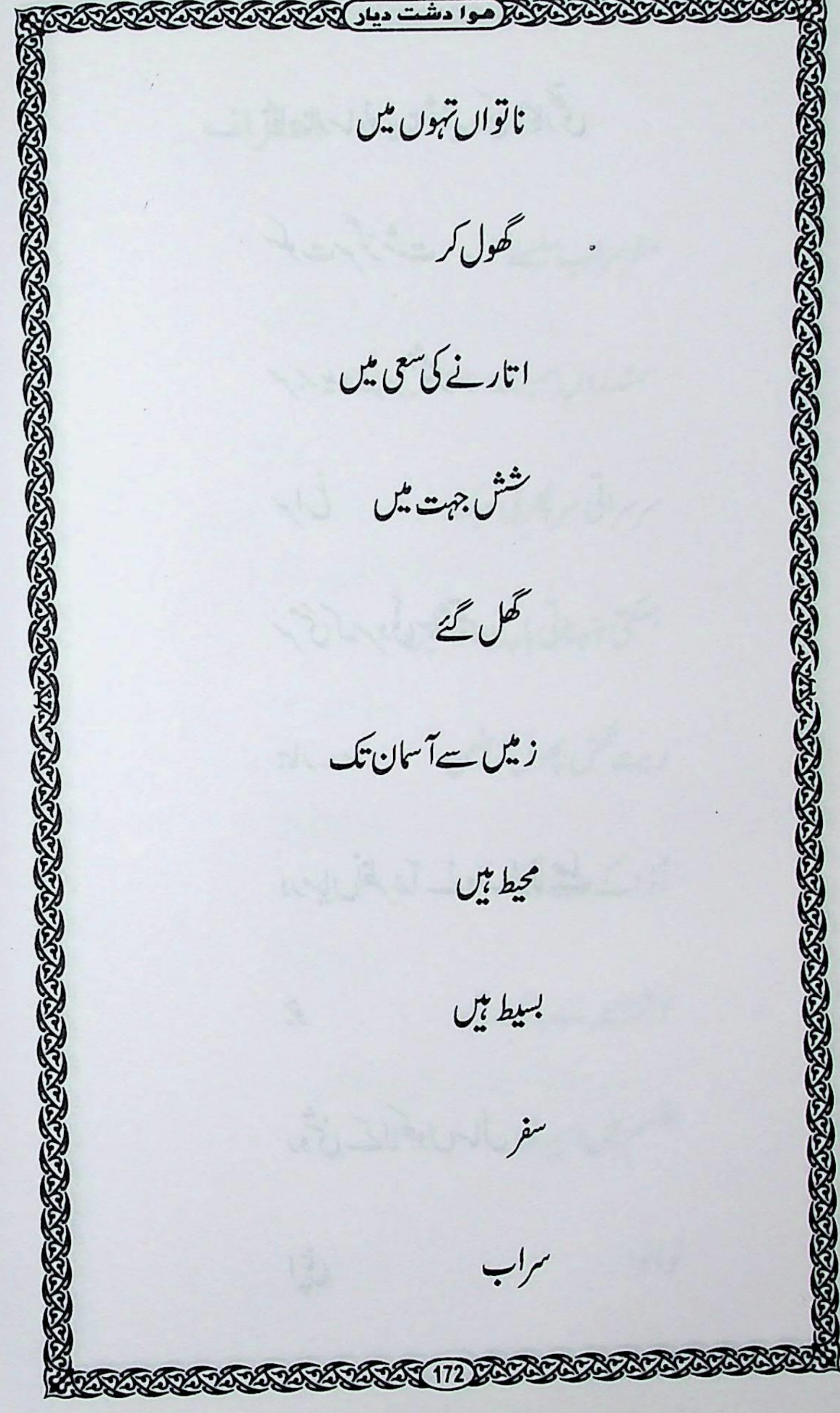
ہمارے

درمیاں نظر نہ آنے والے فاصلے

جو

روشنی کے لاکھوں سال

اپنی



ناتواں تھوں میں

گھول کر

اتارنے کی سعی میں

شش جہت میں

گھل گئے

زمیں سے آسمان تک

محیط ہیں

بسیط ہیں

سفر

سراب

سلسلے

وجود کی حدود سے

عدم کی وسعتیں لئے

رواں دواں

مرے لئے

کہ

میں سراب منتشر

کہ

میں سفر قیام سے خرام تک

کہ

مجھ پہ سلسلوں کی سرحدیں حرام ہیں

میں

سمت ہوں

جسے سراب سلسلے

سفر کے سارے مرحلے

لہو حرارتوں کے درمیان

کشاکشوں میں لے گئے

میں

لامکاں کی وسعتوں میں

پھیلتا چلا گیا

مکیں ہوا تو حرف کا

میں

لفظ لفظ حادثہ

فسونِ چشمِ نارسا

ستارہ

شب کی گود میں

فلک کی انتہا لئے

فریبِ ذات میں مگن

کہ

کائنات کے سفر میں

سلسلہ

سراب کا

گجر

سنہرے خواب کا

صدا جرس کی

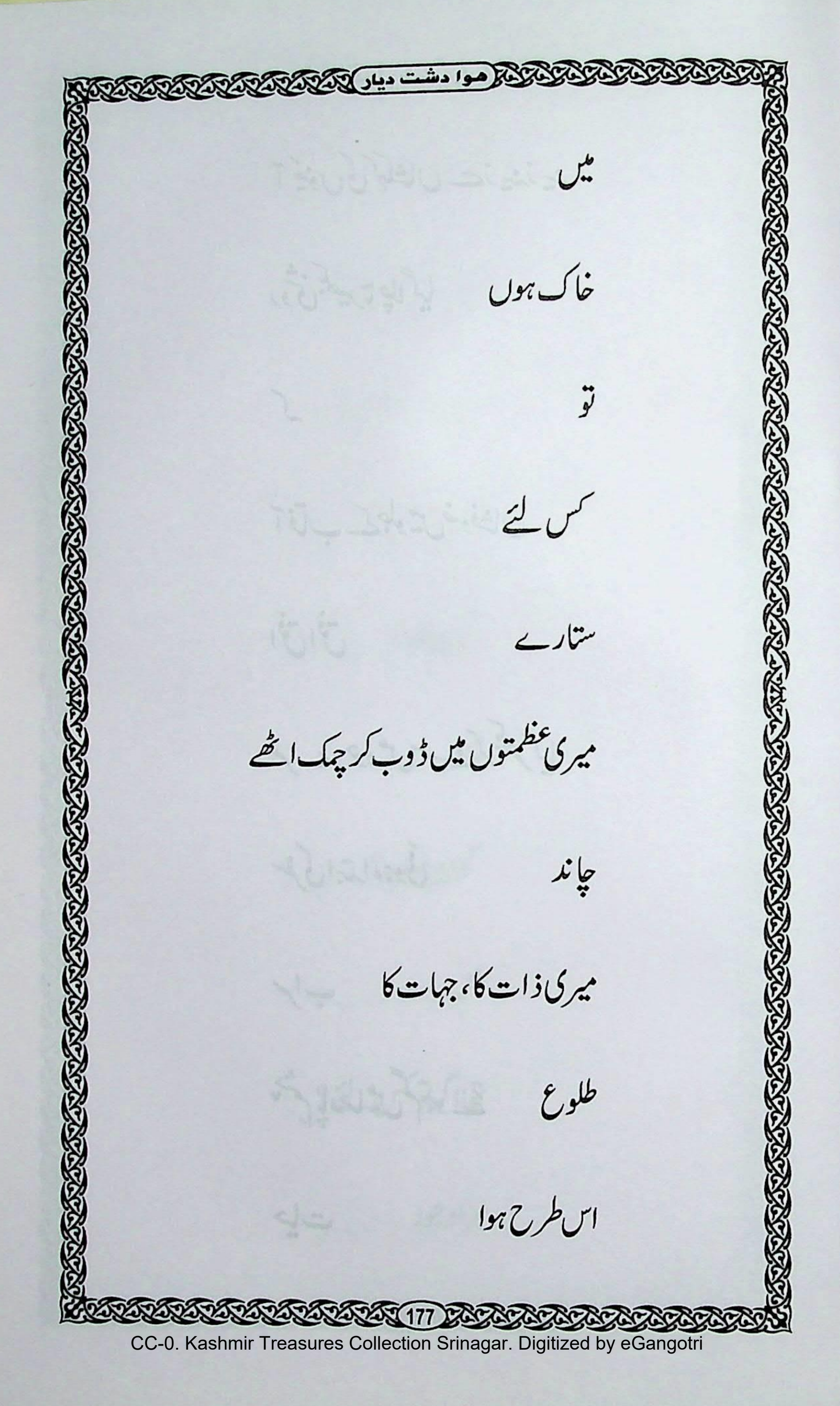
احتساب واضطراب

اِذنِ بےخودی

ہوا ہوا

شکستہ پر

لہو لہو



میں

خاک ہوں

تو

کس لئے

ستارے

میری عظمتوں میں ڈوب کر چمک اٹھے

چاند

میری ذات کا، جہات کا

طلوع

اس طرح ہوا

آئینوں کی کہکشاں سے زینہ زینہ

روشنی بکھیرتا چلا گیا

کہ

آفتاب کے جلو میں ضوفشاں

افق افق

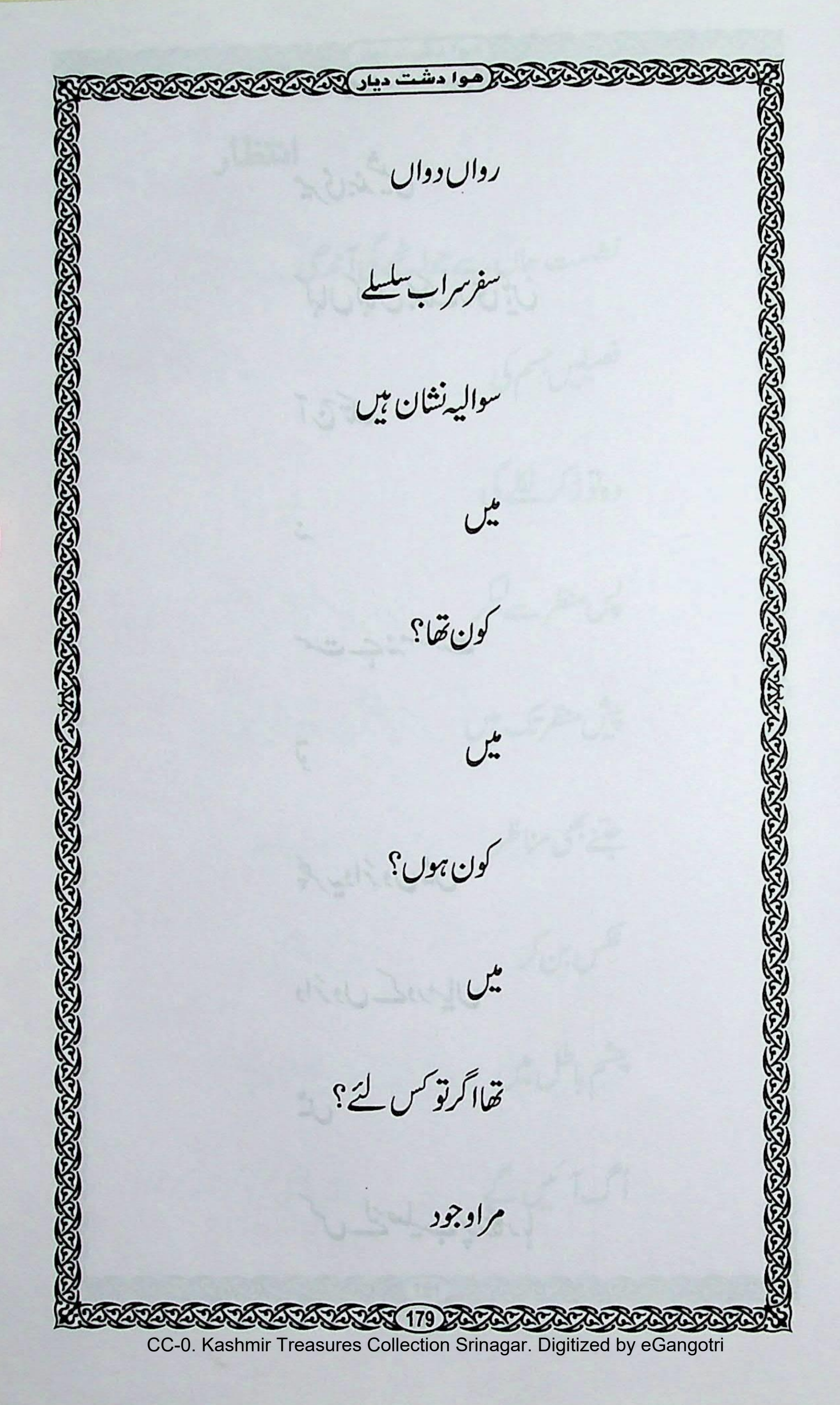
مرے وجود میں سمیٹ کر بکھر گیا

سفر کی ابتداء ہوئی

سراب

چشمِ پارسا میں گم ہوئے

حیات



رواں دواں

سفر سراب سلسلے

سوالیہ نشان ہیں

میں

کون تھا؟

میں

کون ہوں؟

میں

تھا اگر تو کس لئے؟

مرا وجود

میری بند شیں

کہاں کہاں بھٹک رہی ہیں

آج تک

نہ

سمت ہے نہ مسکنت

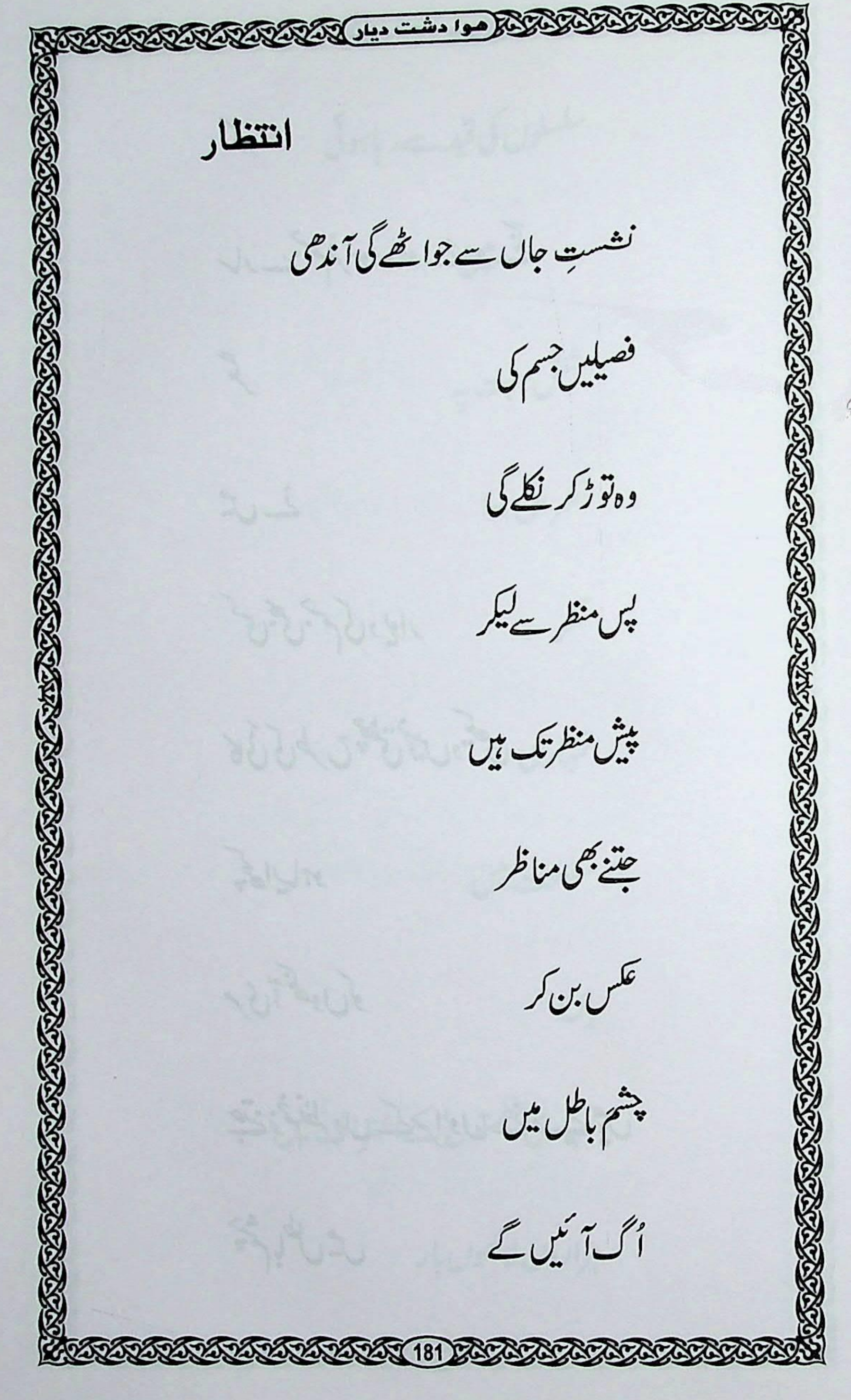
تو

پھر یہ دائروں میں

دائروں کے درمیاں

میں

کس لئے صلیب پر ٹنگا رہا



انتظار

نشستِ جاں سے جو اٹھے گی آندھی

فصیلیں جسم کی

وہ توڑ کر نکلے گی

پس منظر سے لیکر

پیش منظر تک ہیں

جتنے بھی مناظر

عکس بن کر

چشمِ باطل میں

اُگ آئیں گے

کہ

سارے جسم فرسودہ ہوئے ہونگے

مگر

میں نے

کسی بھی جسم کی دیوار

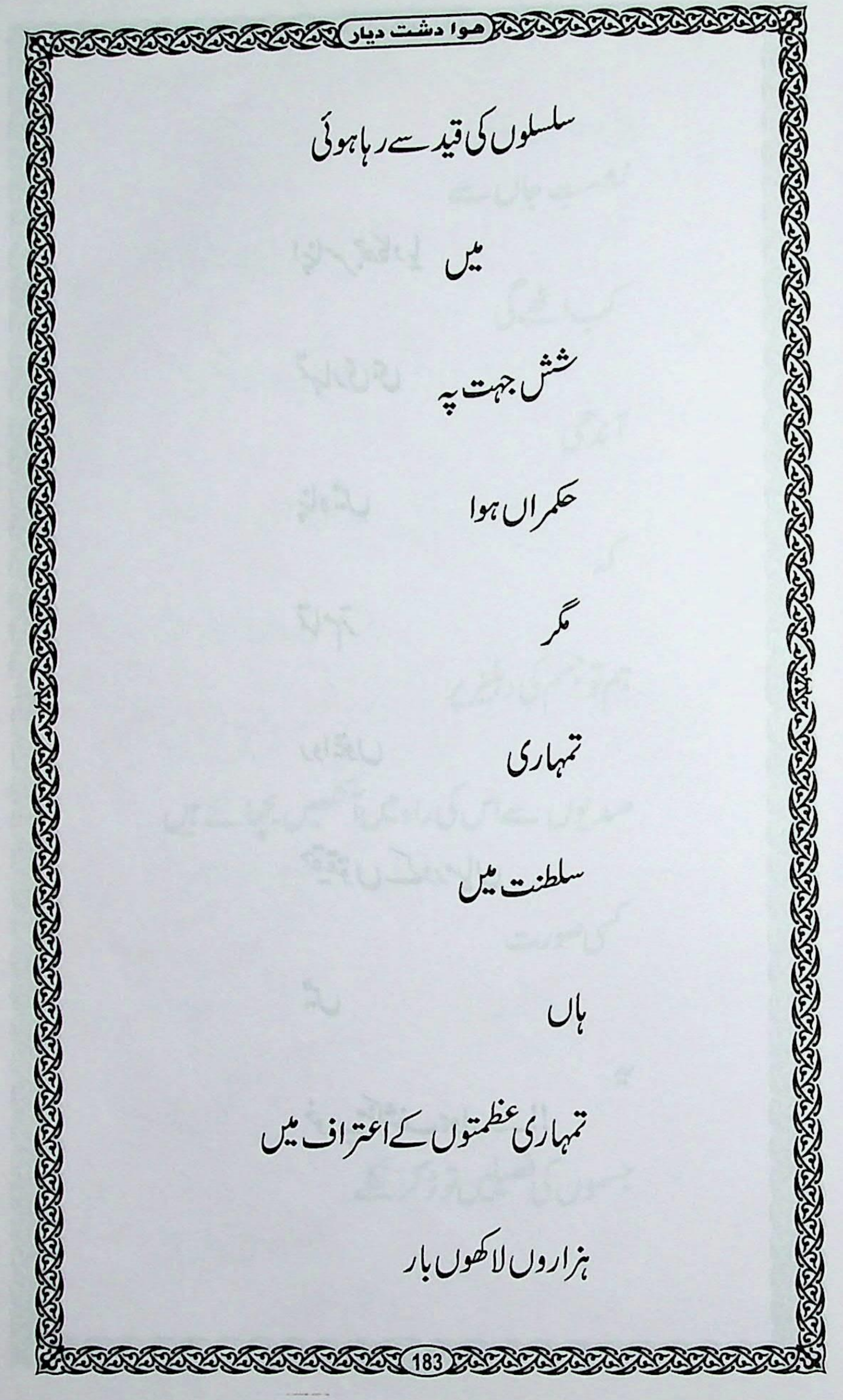
کائی کی طرح چھٹتی نہیں دیکھی

کچھ ایسا ہو

مری آنکھوں کو

جتنے زخم نظروں کے سرابوں نے دیئے ہیں

چشم باطل میں



سلسلوں کی قید سے رہا ہوئی

میں

شش جہت پہ

حکمراں ہوا

مگر

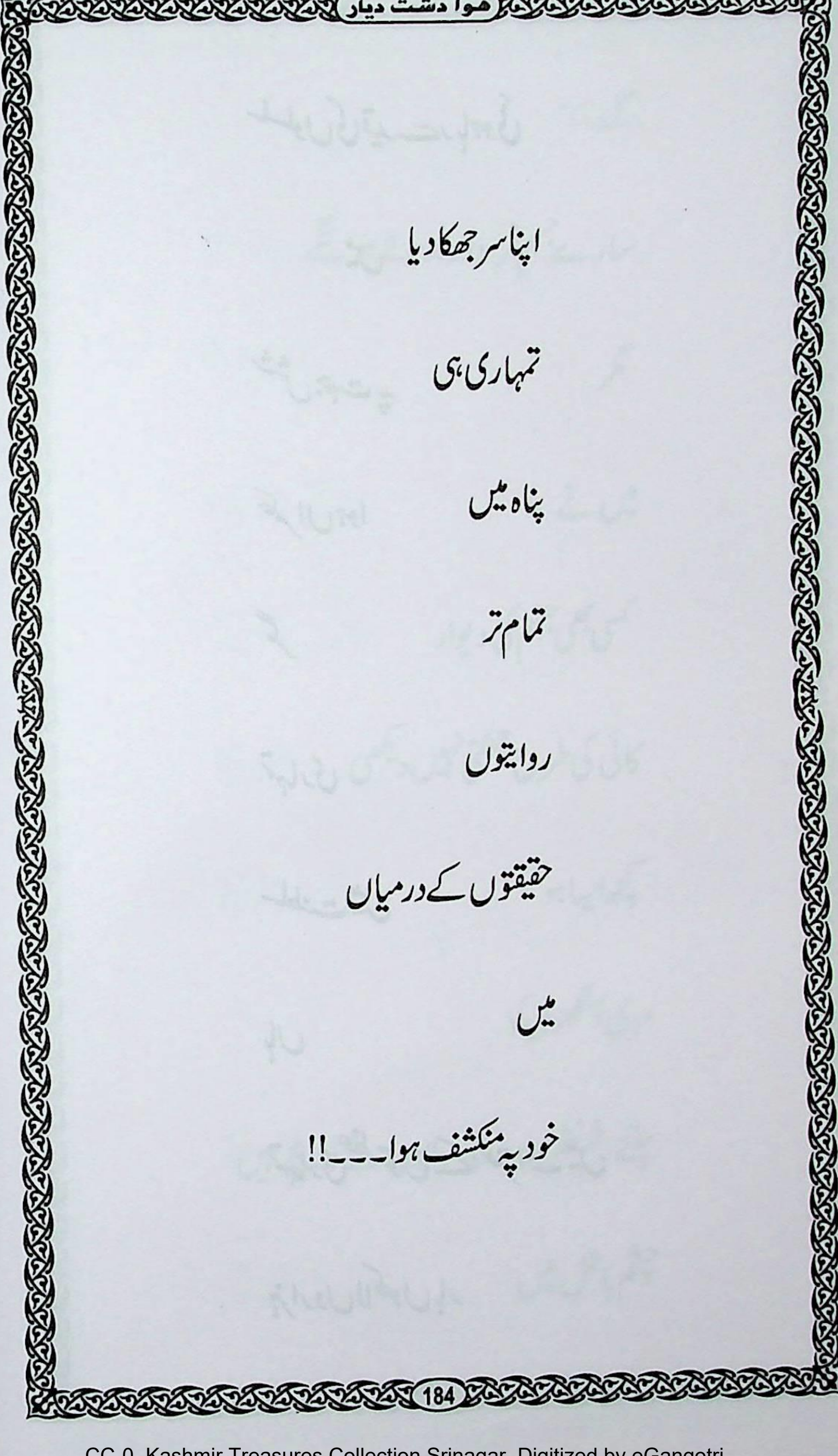
تمہاری

سلطنت میں

ہاں

تمہاری عظمتوں کے اعتراف میں

ہزاروں لاکھوں بار



اپنا سر جھکا دیا

تمہاری ہی

پناہ میں

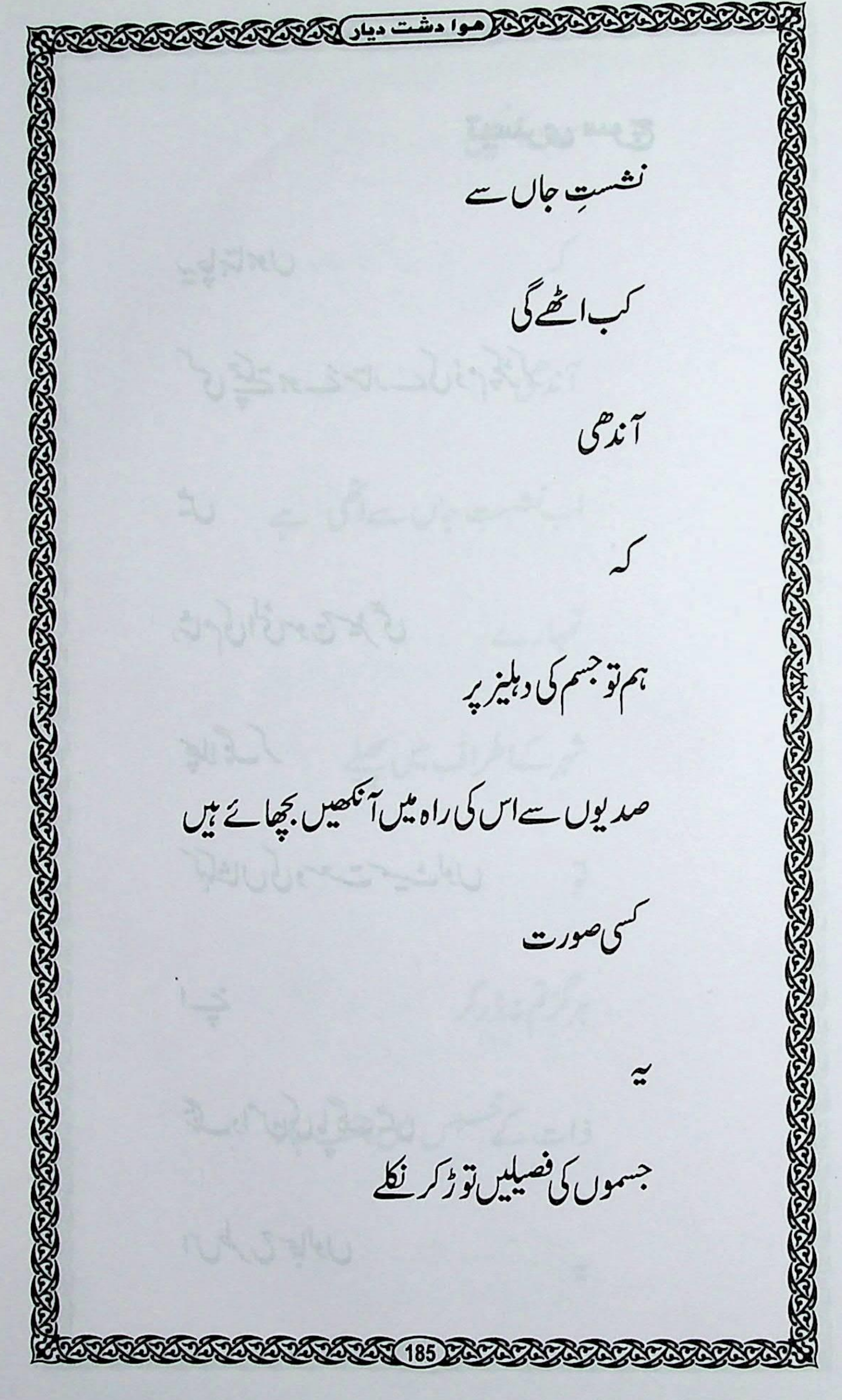
تمام تر

روایتوں

حقیقتوں کے درمیاں

میں

خود پہ منکشف ہوا۔۔۔!!



نشستِ جاں سے

کب اٹھے گی

آندھی

کہ

ہم تو جسم کی دہلیز پر

صدیوں سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہیں

کسی صورت

یہ

جسموں کی فصیلیں توڑ کر نکلے

تیسری سوچ

یہ چاہتا ہوں

کسی چمکتے ہوئے ستارے کی دُم پکڑ کر

میں

شام کی الٹی سوچ سیڑھی

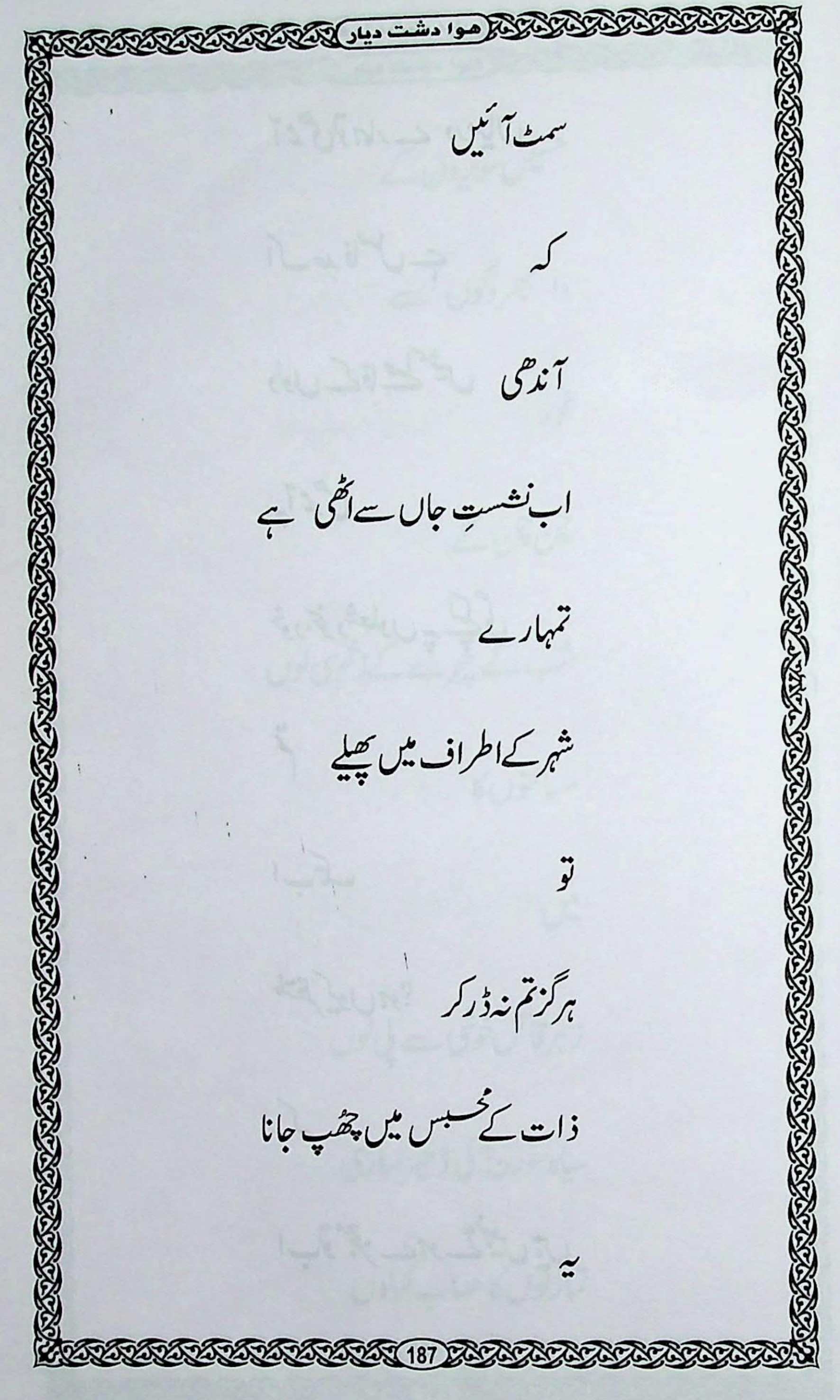
پھلانگ کر

کہکشاں کی وسعت سمیٹ لوں

اپنے

تنگ دامن کی مانگ میں

اس طرح سجالوں



سمٹ آئیں

کہ

آندھی

اب نشستِ جاں سے اٹھی ہے

تمہارے

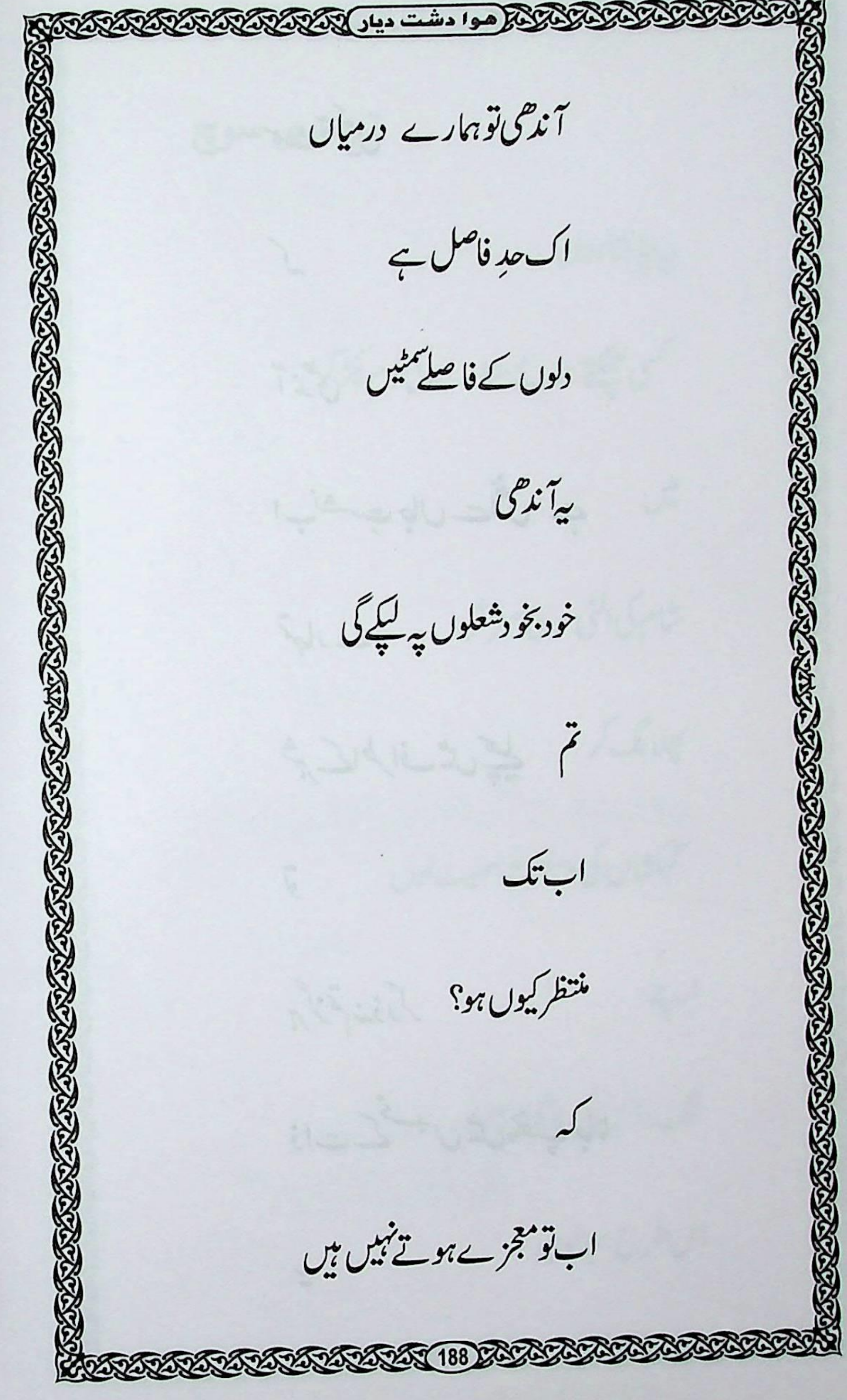
شہر کے اطراف میں پھیلے

تو

ہرگز تم نہ ڈر کر

ذات کے محبس میں چھپ جانا

یہ



آندھی تو ہمارے درمیاں

اک حدِ فاصل ہے

دلوں کے فاصلے سمٹیں

یہ آندھی

خود بخود شعلوں پہ لپکے گی

تم

اب تک

منتظر کیوں ہو؟

کہ

اب تو معجزے ہوتے نہیں ہیں

حسیں سویروں کے

وا جھروکوں سے

نور

چن چن کے

شب کے چہرے کے زخم سی لوں

مسافتوں کا

میں

زہر قاتل خوشی سے پی لوں

سیاہ سورج کی ڈھیر ساری

تمازتوں کا حساب کرلوں

افق سے ہوتے ہوئے

افق تک

روپہلے بادل کی کاشت کرلوں

اگر

یہ سب میرے بس میں ہوتا

میں

جانتا ہوں

مگر

مرے بس میں کچھ نہیں ہے

یہ سوچتا ہوں

کہ

شب سمندر کی

بپھری موجوں کے

رُخ سفینے پہ بیٹھ کر

جب

رمق رمق بحر و بر کے

الجھے سفر پہ نکلوں

تو

چاندنی بیقرار ہو کر مجھے سُلائے

تھپک تھپک کر

یا

اپنی آغوش میں بٹھا دے

یا

اپنی پلکیں دراز کر کے

سفر کی ساری

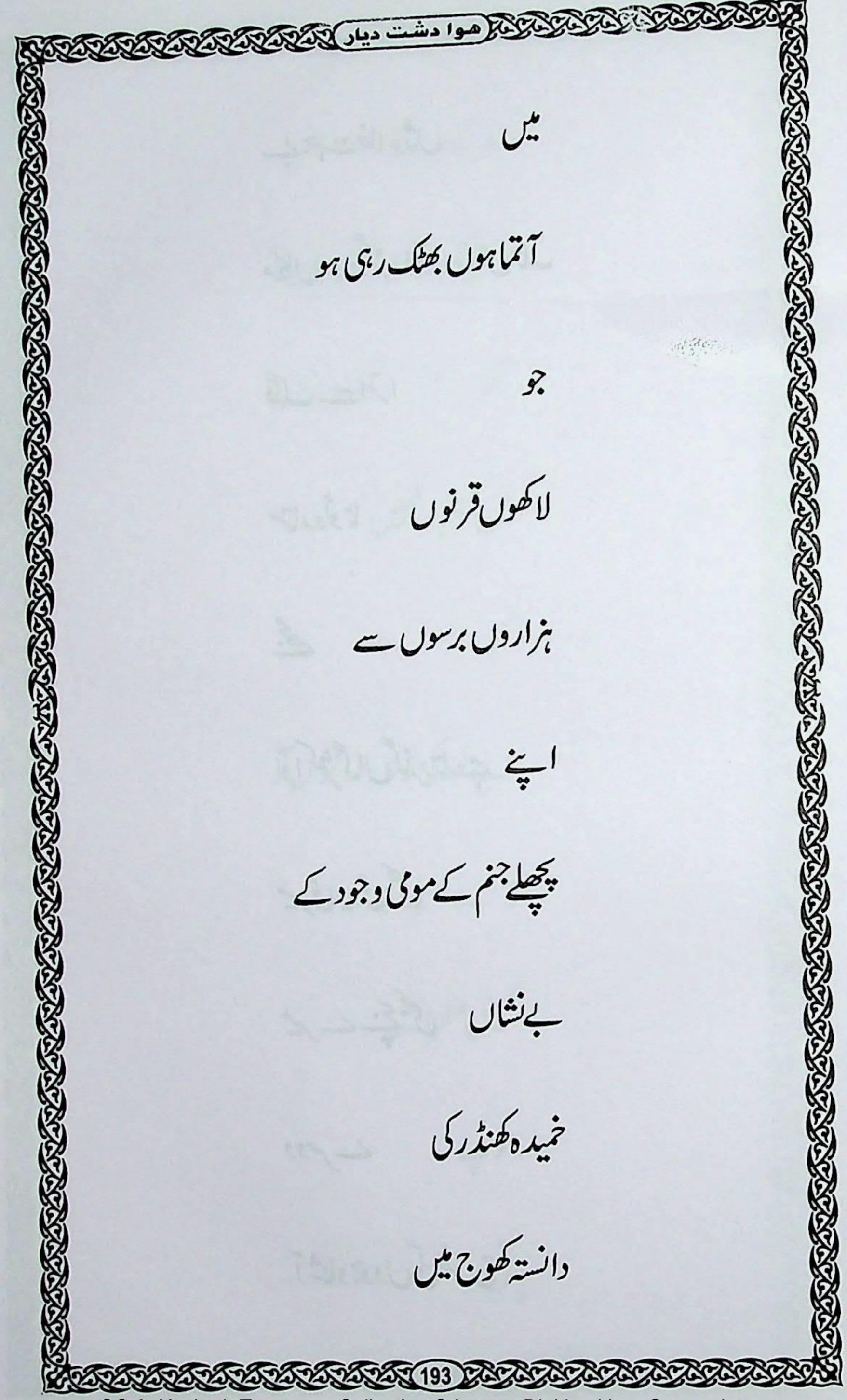
تھکاوٹوں پر ہی

سایہ کر دے

یہ

چاہتا ہوں

سحر کی پازیب سے ابلتے



میں

آتما ہوں بھٹک رہی ہو

جو

لاکھوں قرنوں

ہزاروں برسوں سے

اپنے

پچھلے جنم کے مومی وجود کے

بے نشاں

خمیدہ کھنڈر کی

دانستہ کھوج میں

بے جہت خلاء میں

مکاں سے گزرا تو لامکاں تک

فلک سے اترا

ستارہ ٹوٹا

مجھے

تو اکثر گماں گذرتا ہے

میری بیوی بھی

میرے بچے بھی

دوسرے

آشنا وجودں کی طرح

میرے لئے

ازل سے ہی اجنبی ہیں

مگر

میں گوتم نہیں

کہ

اپنے لہو کی زندہ امانتوں کو

زمانے بھر کے

عمیق صحرا میں

دھوپ

پانی

سراب

مٹی کے قید خانے میں

پا بہ جولاں تڑپتا چھوڑوں

بنوں میں بھٹکوں

کہ

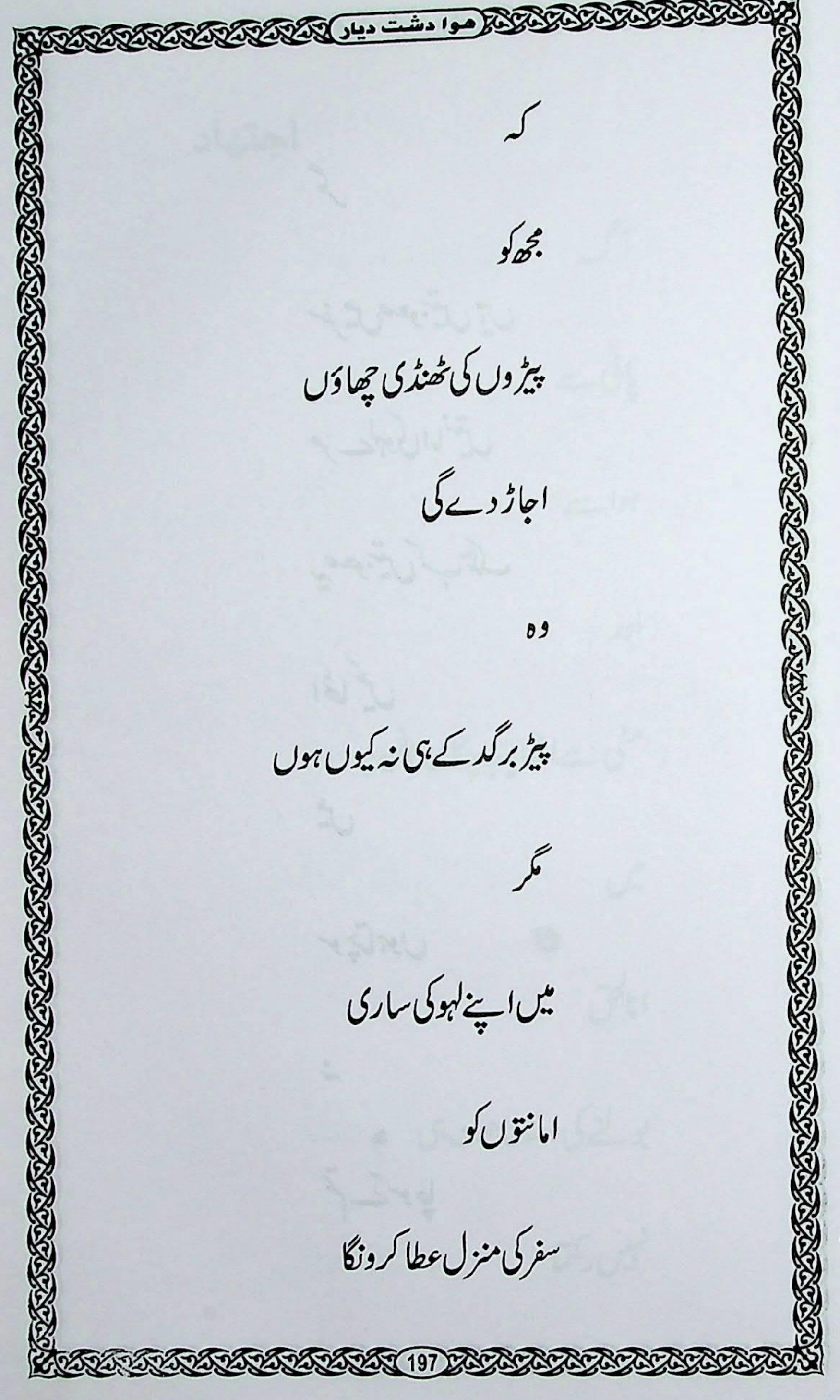
گیان پاؤں

میں

جانتا ہوں

کہ

گیان مجھ کو ملا یہی ہے



کہ

مجھ کو

پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں

اجاڑ دے گی

وہ

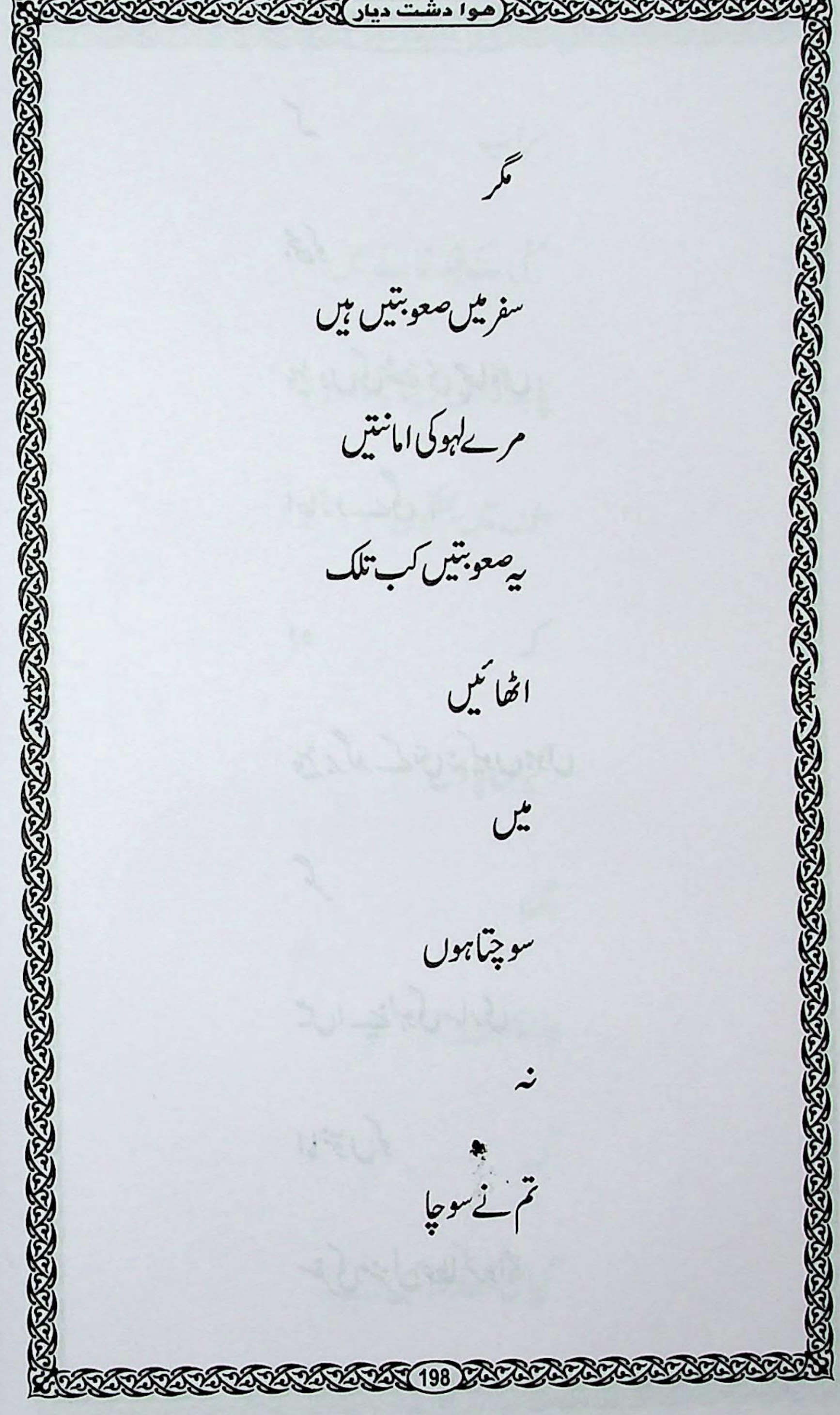
پیڑ برگد کے ہی نہ کیوں ہوں

مگر

میں اپنے لہو کی ساری

امانتوں کو

سفر کی منزل عطا کرونگا



مگر

سفر میں صعوبتیں ہیں

مرے لہو کی امانتیں

یہ صعوبتیں کب تلک

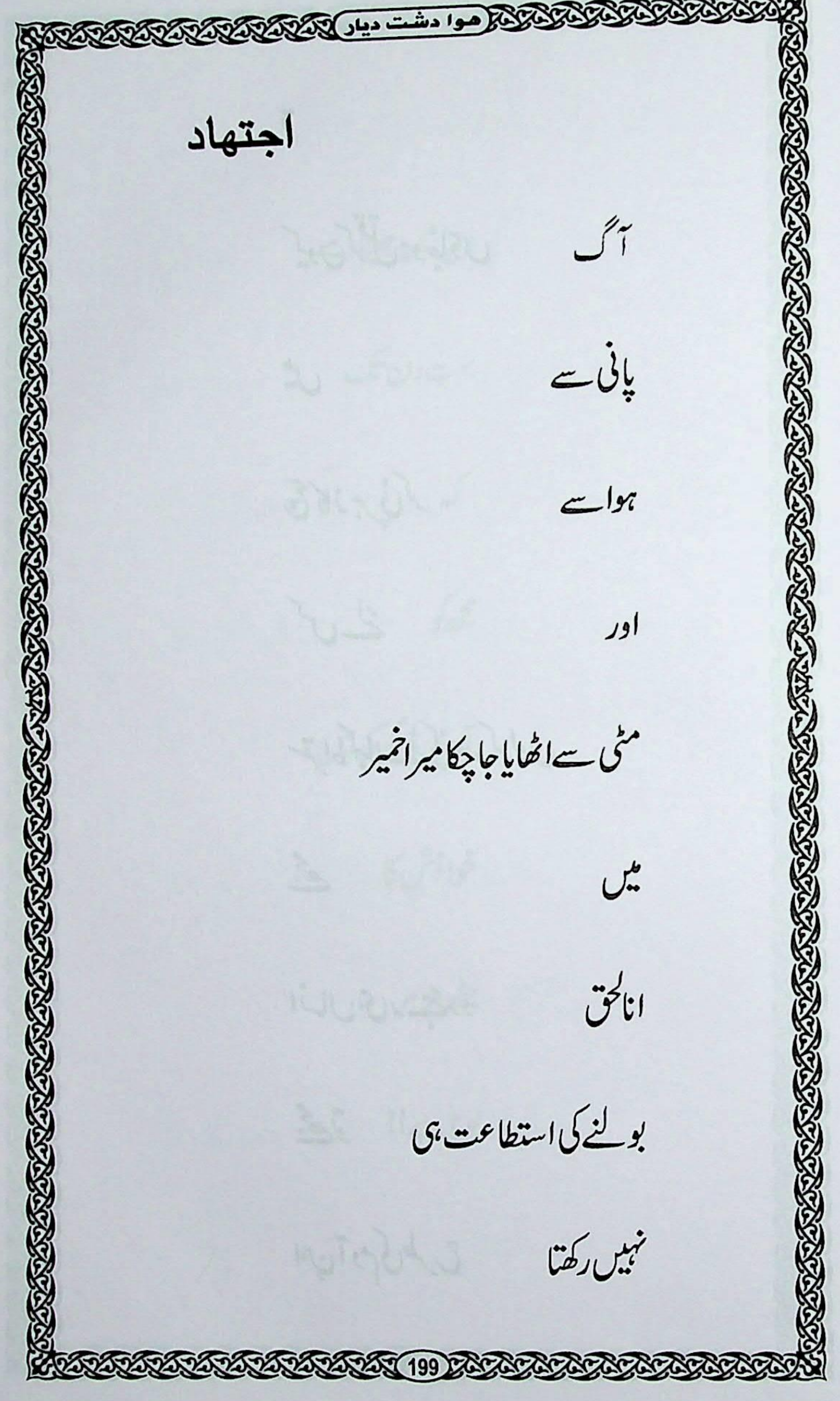
اٹھائیں

میں

سوچتا ہوں

نہ

تم نے سوچا



اجتہاد

آگ

پانی سے

ہوا سے

اور

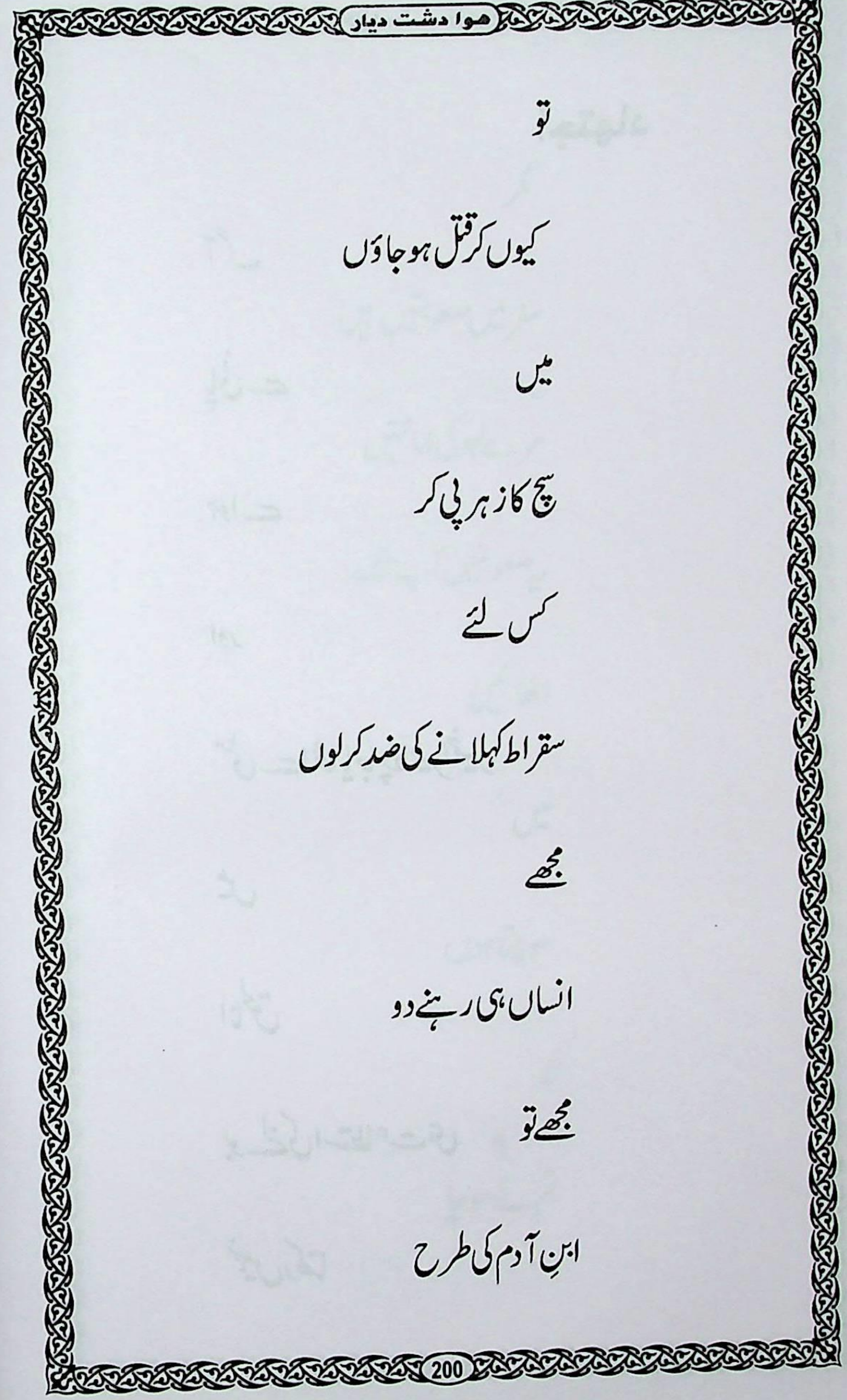
مٹی سے اٹھایا جاچکا میرا خمیر

میں

انالحق

بولنے کی استطاعت ہی

نہیں رکھتا



تو

کیوں کر قتل ہو جاؤں

میں

سچ کا زہر پی کر

کس لئے

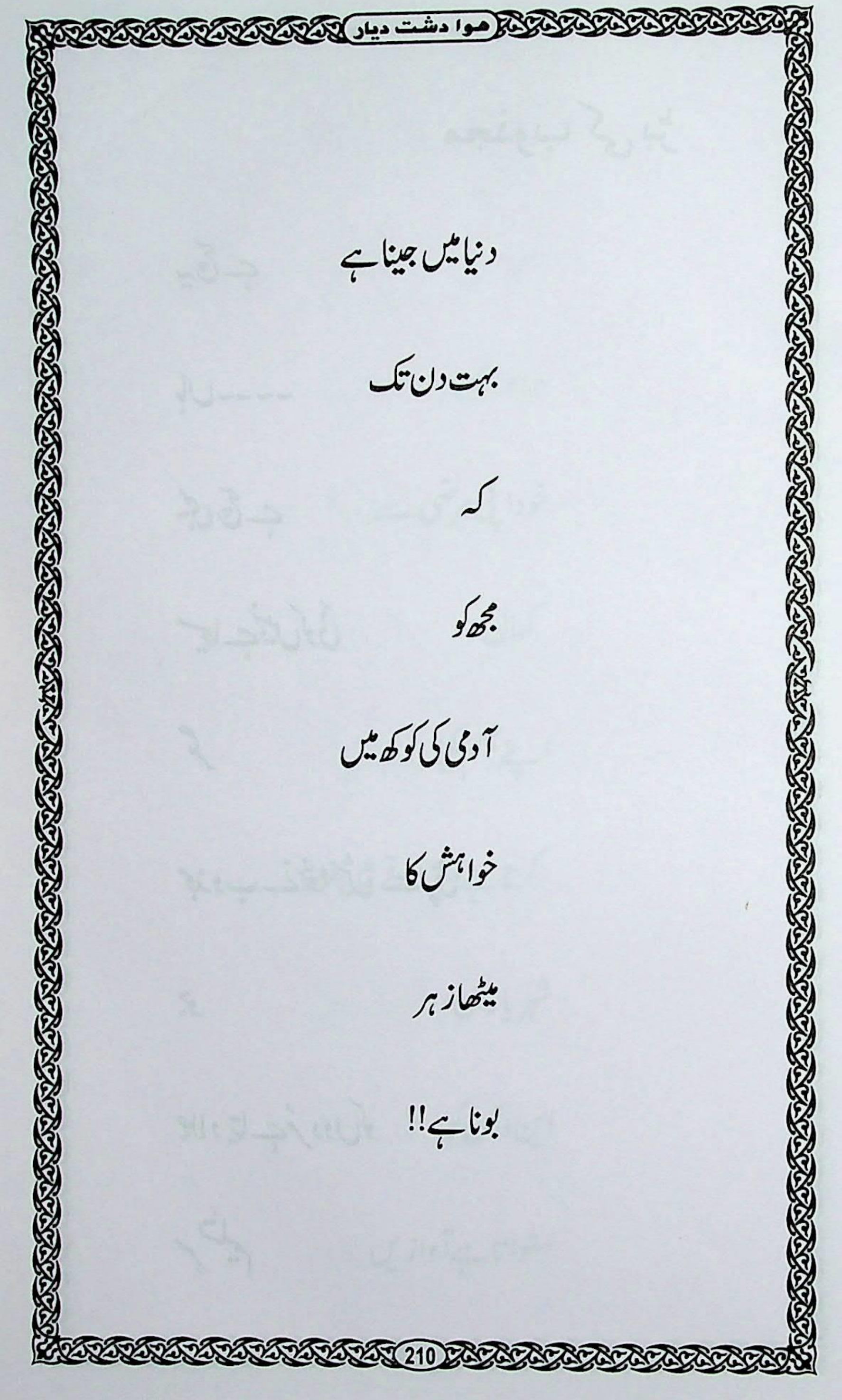
سقراط کہلانے کی ضد کر لوں

مجھے

انساں ہی رہنے دو

مجھے تو

ابنِ آدم کی طرح



دنیا میں جینا ہے

بہت دن تک

کہ

مجھ کو

آدمی کی کوکھ میں

خواہش کا

میٹھا زہر

بونا ہے!!

مجذوب کی بڑ

یہ سچ ہے

ہاں۔۔۔

یہی سچ ہے

مسیحا ہے نہیں کوئی

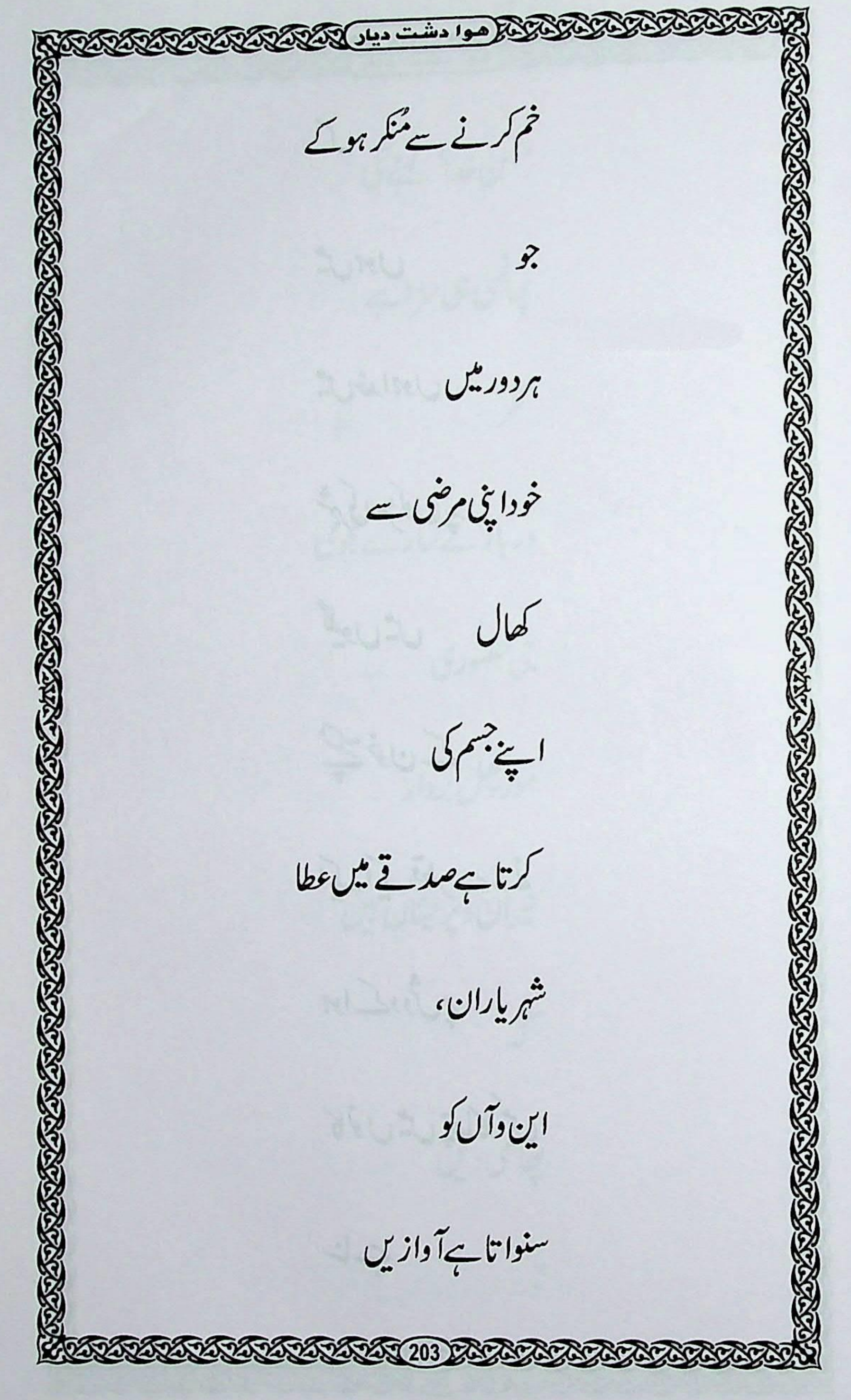
مگر

مجذوب نے خواہش سے اپنی

جو

جِلا دیتا ہے مُردوں کو

سرِ تسلیم



خم کرنے سے منکر ہو کے

جو

ہر دور میں

خود اپنی مرضی سے

کھال

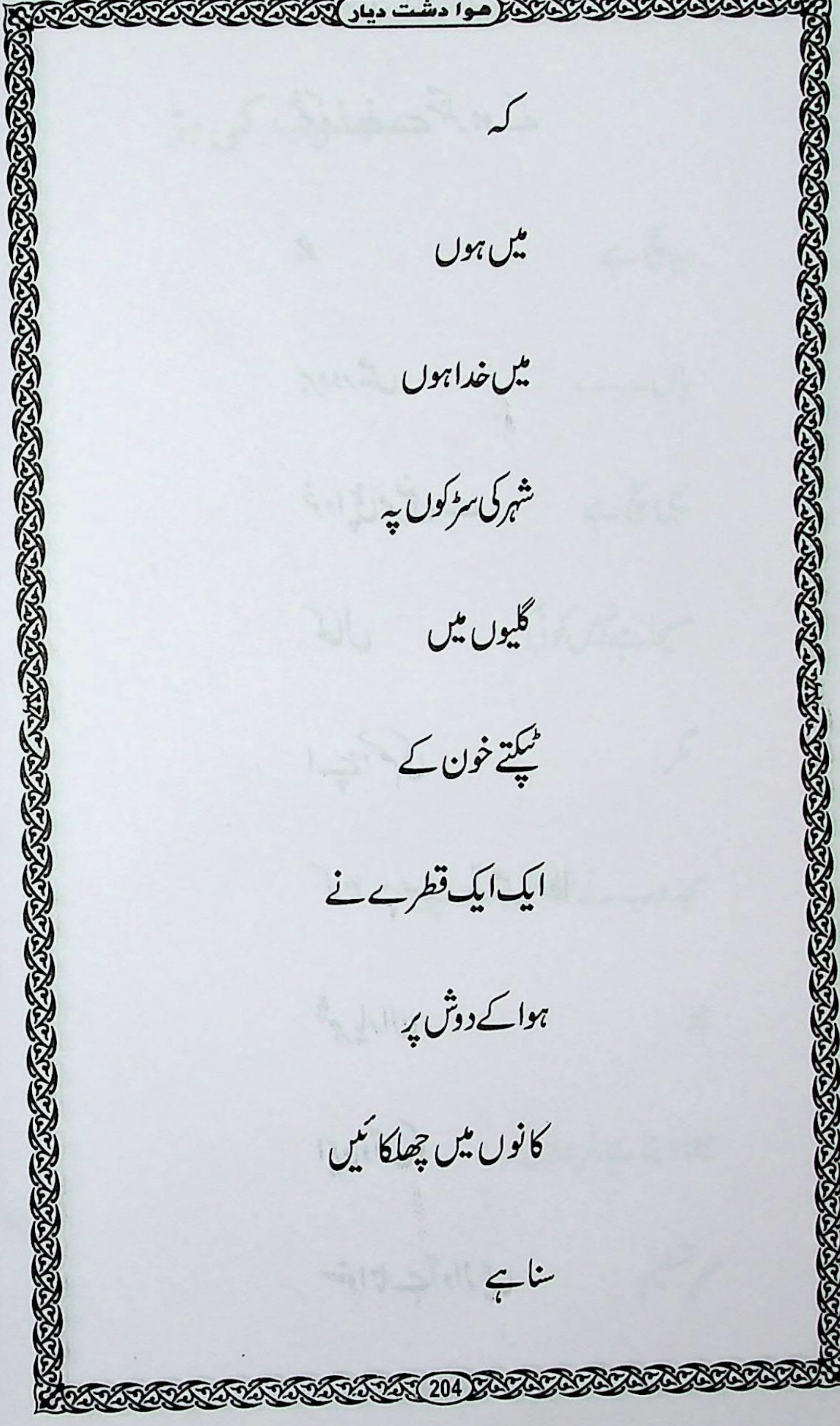
اپنے جسم کی

کرتا ہے صدقے میں عطا

شہریاران،

این وآں کو

سنواتا ہے آوازیں



کہ

میں ہوں

میں خدا ہوں

شہر کی سڑکوں پہ

گلیوں میں

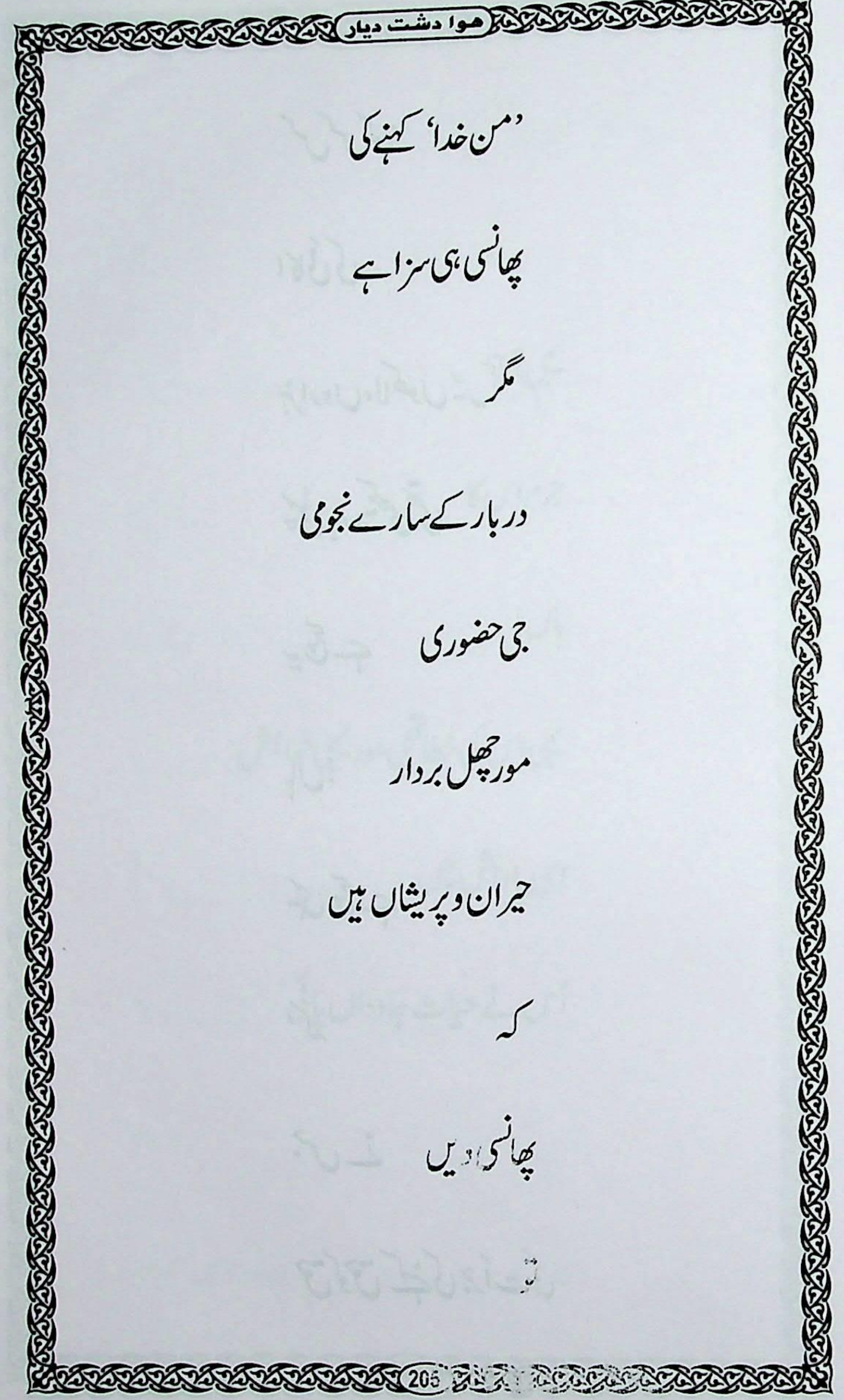
ٹپکتے خون کے

ایک ایک قطرے نے

ہوا کے دوش پر

کانوں میں چھلکائیں

سنا ہے



'من خدا' کہنے کی

پھانسی ہی سزا ہے

مگر

دربار کے سارے نجومی

جی حضوری

مورچھل بردار

حیران وپریشاں ہیں

کہ

پھانسی دیں

کس کس کو؟

اکائی کی

ہزاروں، لاکھوں میں تجسیم

پہلی بار دیکھی تھی

یہ سچ ہے

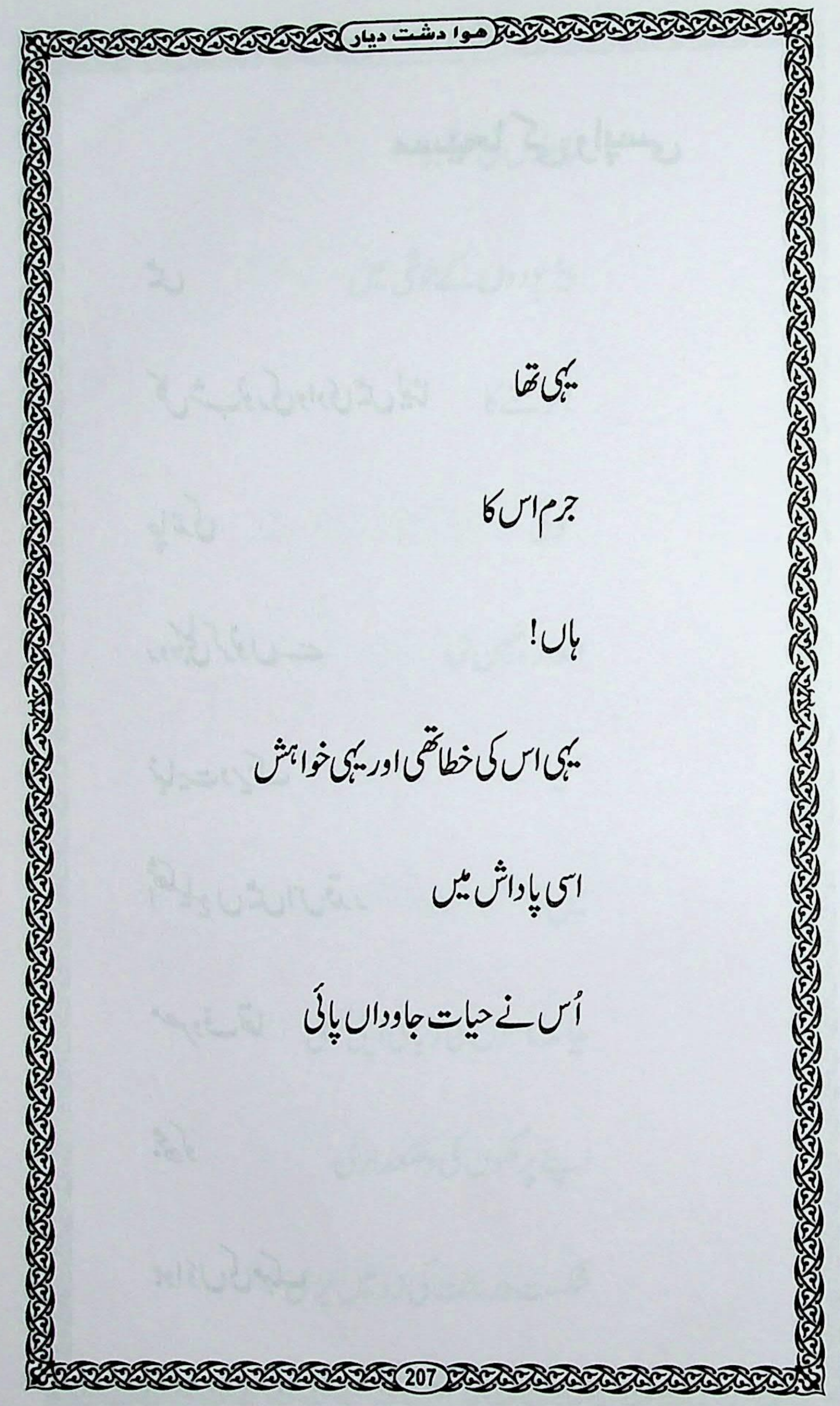
ہاں!

یہی سچ ہے

کہ

جس نے

حق کو حق کہنے کی جرأت کی



یہی تھا

جرم اس کا

ہاں!

یہی اس کی خطا تھی اور یہی خواہش

اسی پاداش میں

اُس نے حیات جاوداں پائی

مسیحا کی واپسی

میں

کل شب نور کی وادی میں لیٹا

چاند کی

روپہلی کرنوں سے

نہایت دیر تک

اٹھکیلیوں میں اس قدر

مصروف تھا

مجھ کو

ہواؤں کی مہک

پھولوں کی خوشبو

پیڑ پودوں کے خوشی میں

جھومنے کا

کوئی

اندازہ نہیں تھا

کہ

میں تو

چاند ماموں کی زبانی اپنی بستی

اپنے پرکھوں کی وضعداری

شکست وریخت کی زد میں پڑی

اقدار

رشتوں کے تقدس کی

کہانی

سّنُ کے حیراں و پریشاں

مضطرب غم سے

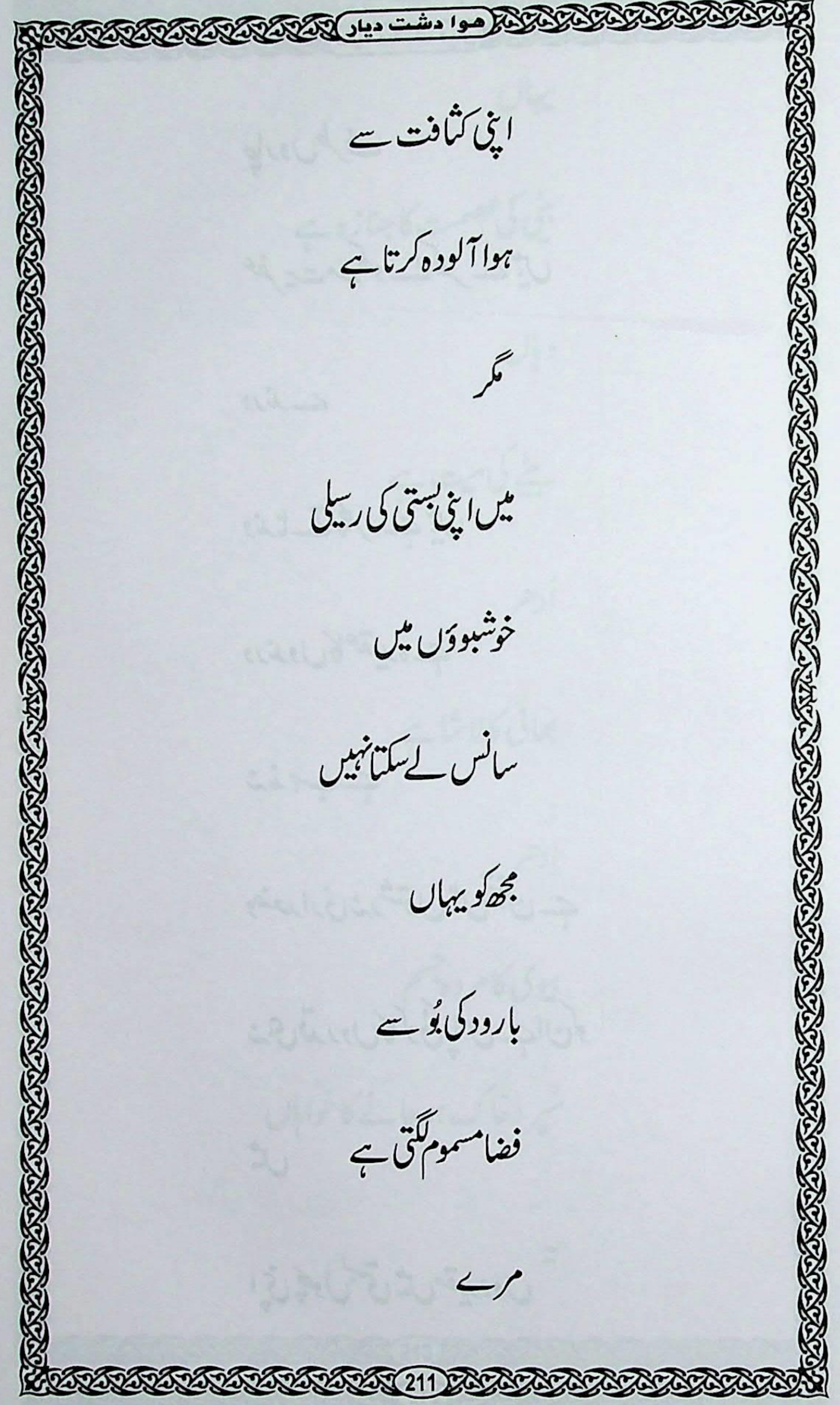
میں

پیڑوں کی ہی شاخوں میں اٹک کر رہ گیا

میں مانتا ہوں

میری بستی میں مِلیں ہیں

اور نہ ان کی چمنیوں کا ہی دھواں



اپنی کثافت سے

ہوا آلودہ کرتا ہے

مگر

میں اپنی بستی کی رسیلی

خوشبوؤں میں

سانس لے سکتا نہیں

مجھ کو یہاں

بارود کی بُو سے

فضا مسموم لگتی ہے

مرے

چاروں طرف

عفریت منہ کھولے کھڑے ہیں

درندے

دندناتے پھر رہے ہیں

درندوں کا عقیدہ ہے

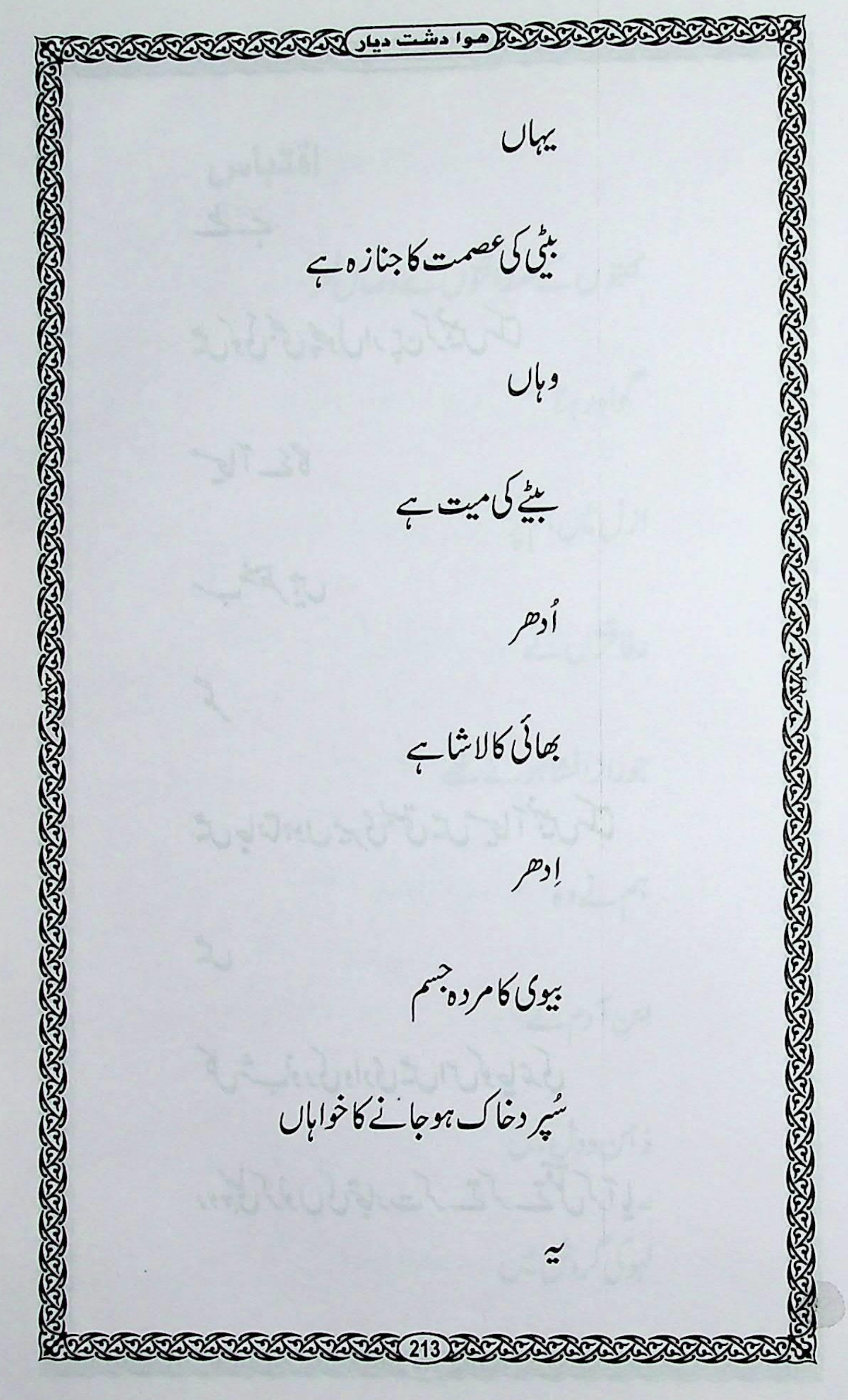
نہ مذہب ہے

وضعداری نہ رشتوں میں تیقن ہے

نہ ہی قدروں کا کوئی پاس ہے ان کو

میں

اپنی پھول بستی میں مقید ہوں



یہاں

بیٹی کی عصمت کا جنازہ ہے

وہاں

بیٹے کی میت ہے

اُدھر

بھائی کا لاشا ہے

اِدھر

بیوی کا مردہ جسم

سُپردِ خاک ہو جانے کا خواہاں

یہ

طے ہے

میں کوئی بھی پھول ارپن کر نہیں سکتا

مسیحا آئے گا

سب منتظر ہیں

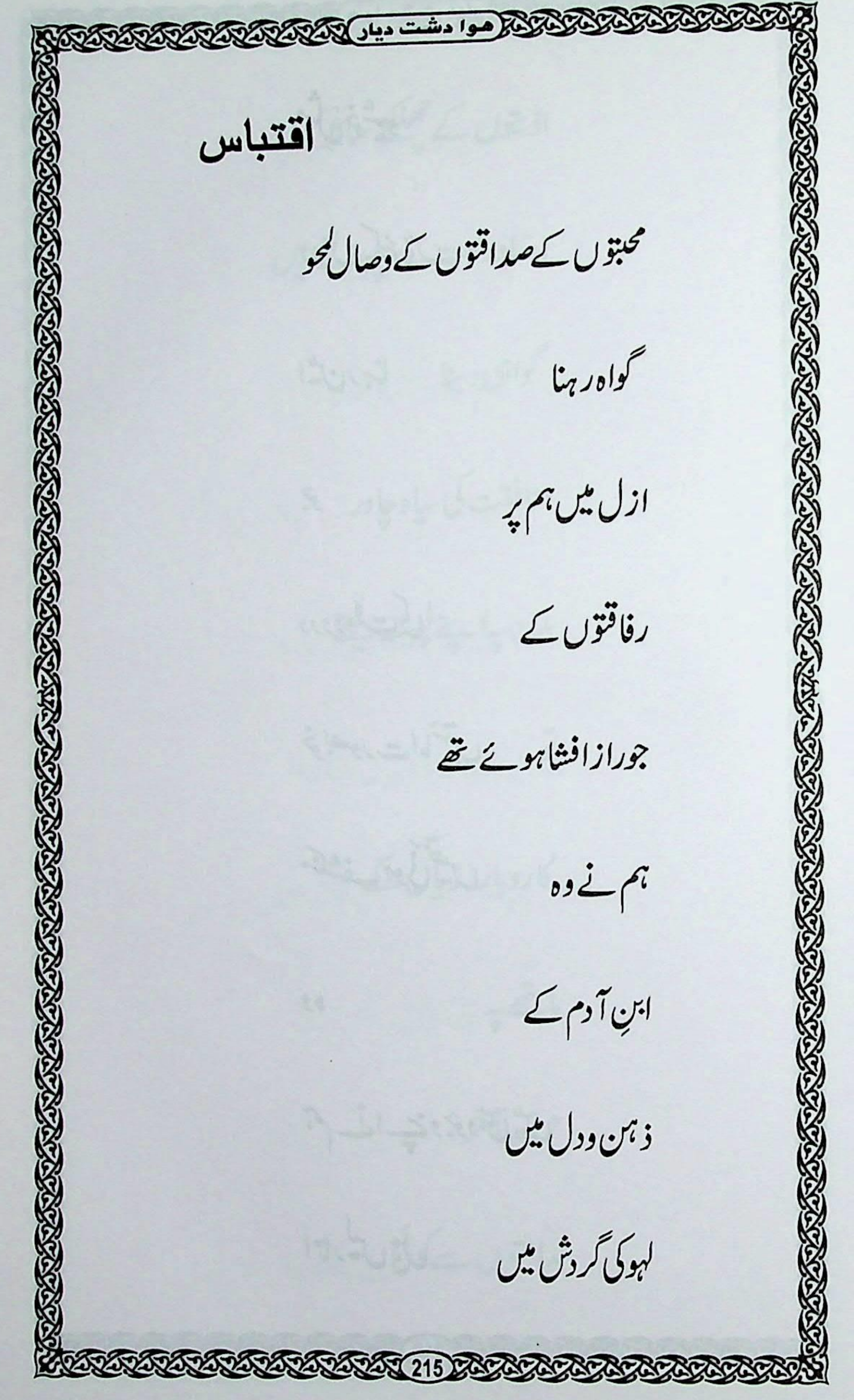
مگر

میں جانتا ہوں میری بستی میں مسیحا آ نہیں سکتا

میں

کل شب نور کی وادی میں اس کو چاندکی

رو پہلی کرنوں کی تجارت کرتے کرتے قتل کر آیا۔



اقتباس

محبتوں کے صداقتوں کے وصال لمحو

گواہ رہنا

ازل میں ہم پر

رفاقتوں کے

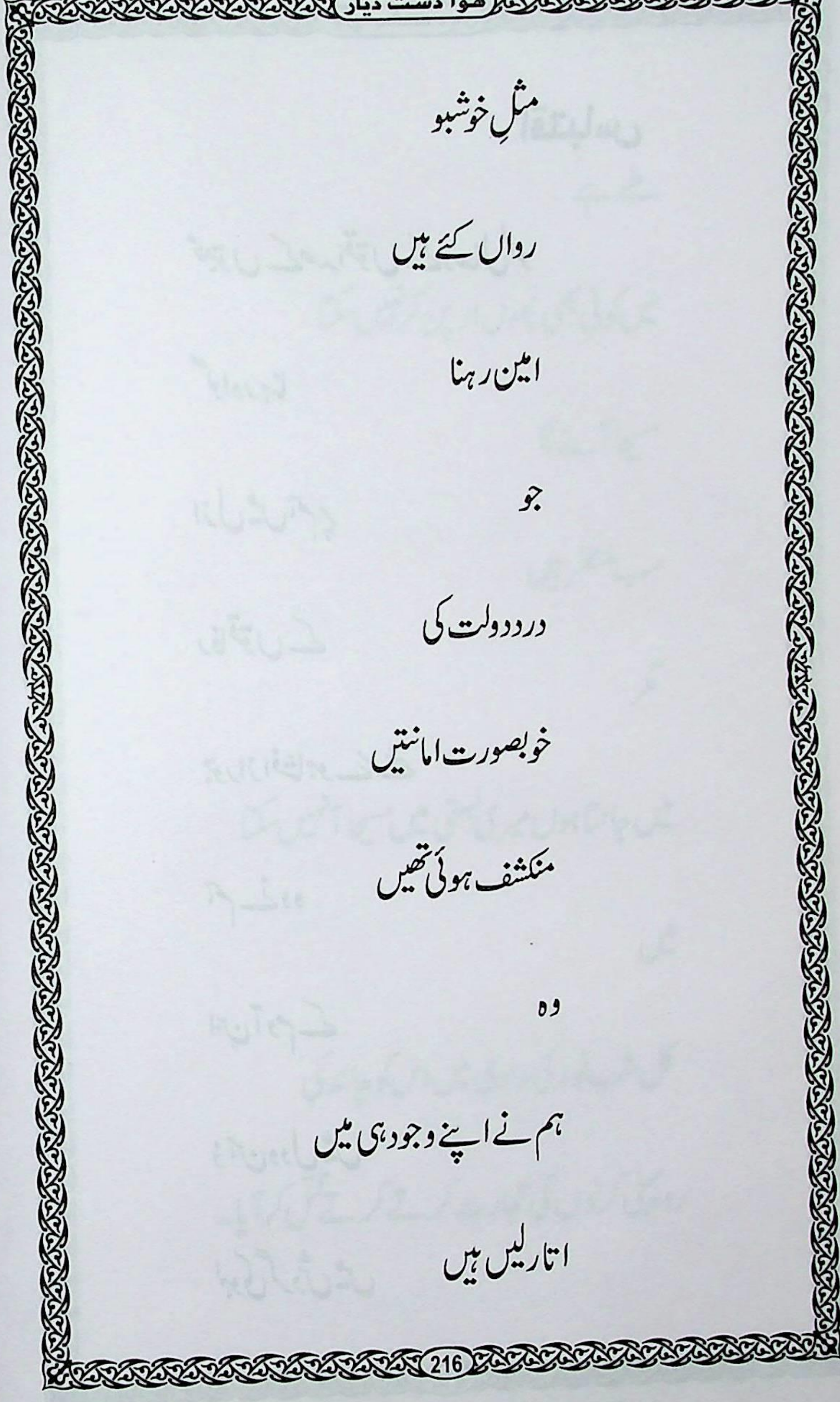
جو راز افشا ہوئے تھے

ہم نے وہ

ابنِ آدم کے

ذہن و دل میں

لہو کی گردش میں



مثلِ خوشبو

رواں کیئے ہیں

امین رہنا

جو

دردِ دولت کی

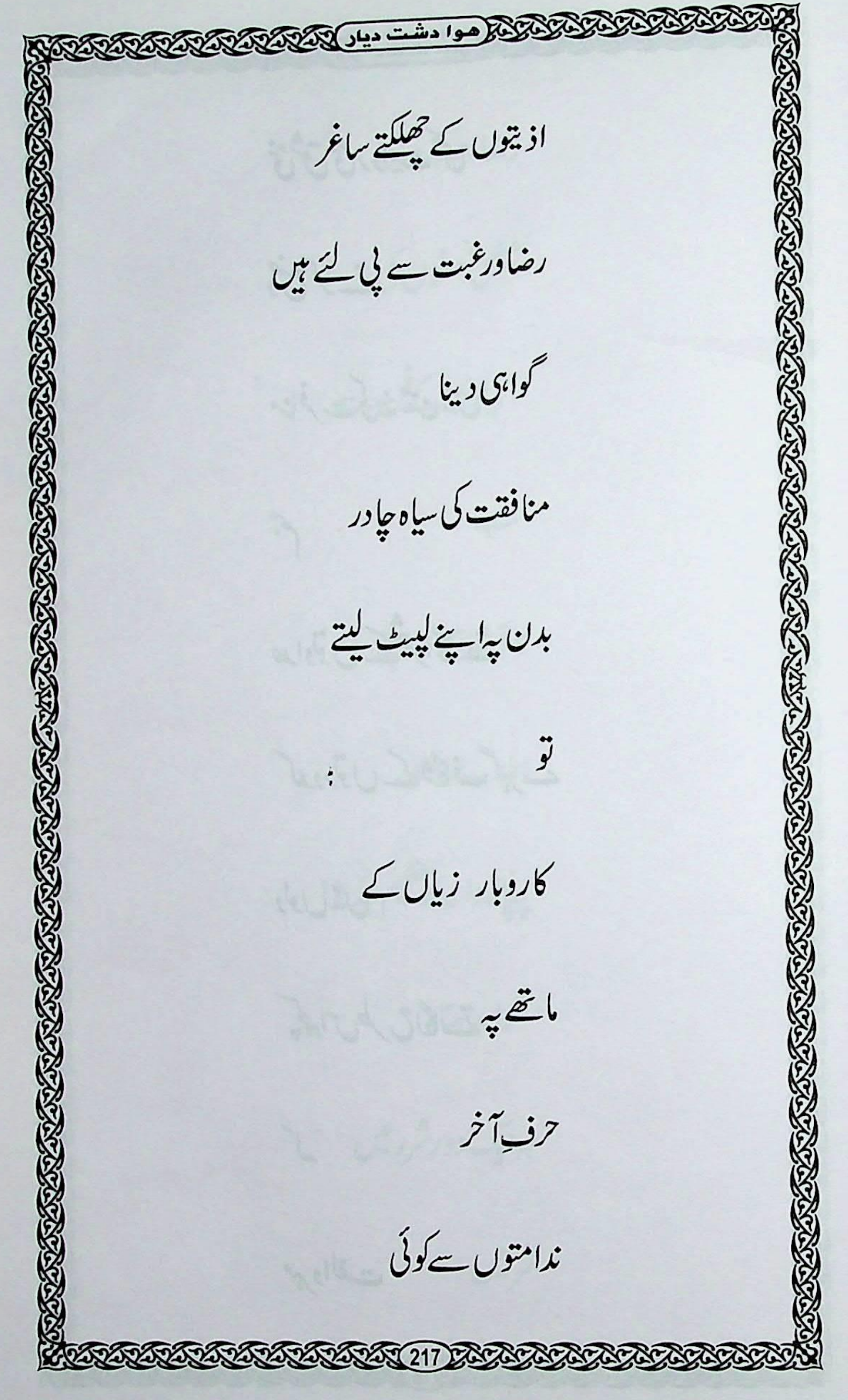
خوبصورت امانتیں

منکشف ہوئی تھیں

وہ

ہم نے اپنے وجود ہی میں

اتار لیں ہیں



اذیتوں کے چھلکتے ساغر

رضا و رغبت سے پی لئے ہیں

گواہی دینا

منافقت کی سیاہ چادر

بدن پہ اپنے لپیٹ لیتے

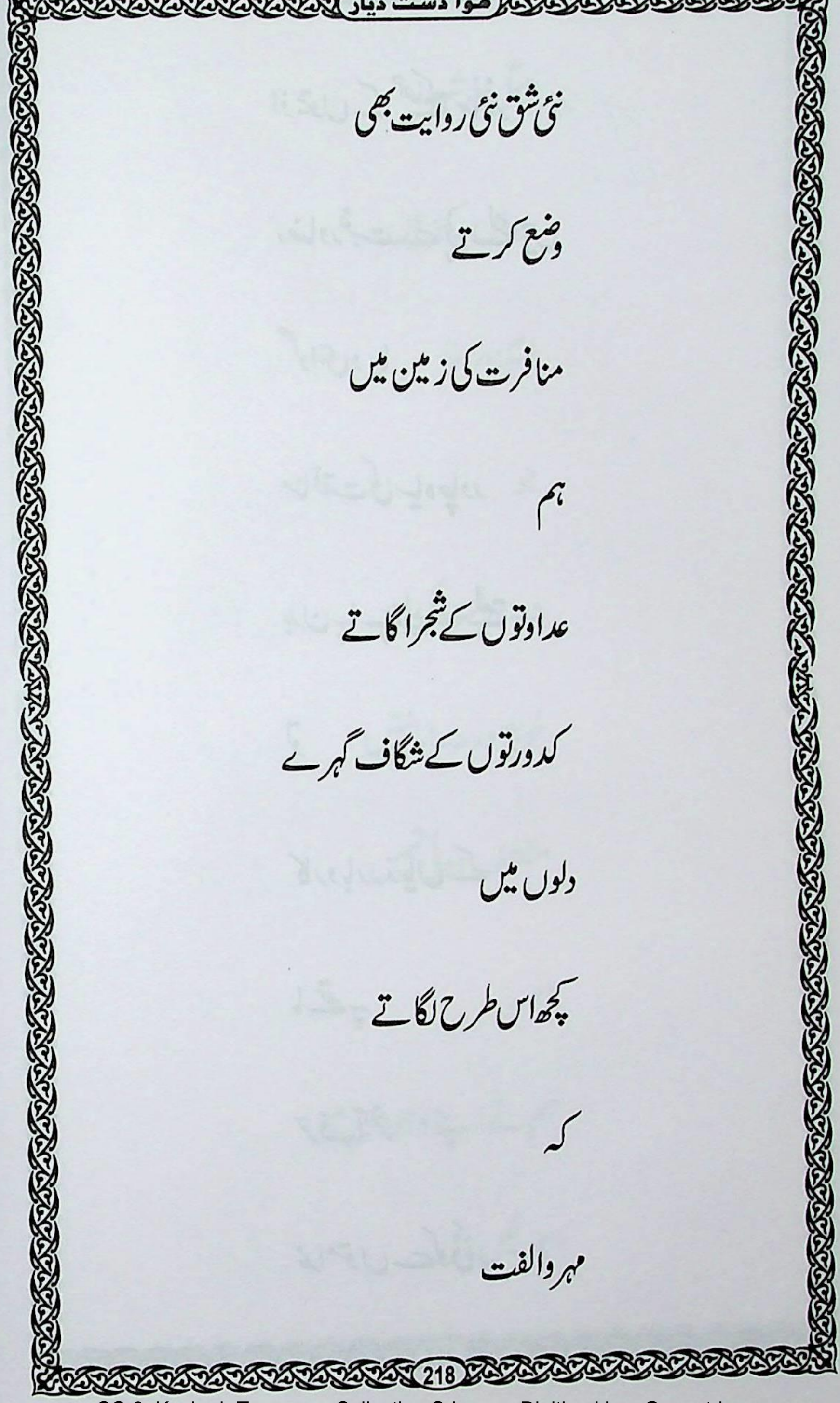
تو

کاروبار زیاں کے

ماتھے پہ

حرفِ آخر

ندامتوں سے کوئی



نئی شق نئی روایت بھی

وضع کرتے

منافرت کی زمین میں

ہم

عداوتوں کے شجر اگاتے

کدورتوں کے شگاف گہرے

دلوں میں

کچھ اس طرح لگاتے

کہ

مہر والفت

رضا، مروت کی

میٹھی فصلوں کی

آبیاری کے فن سے

سب

ناآشنا ہی رہتے

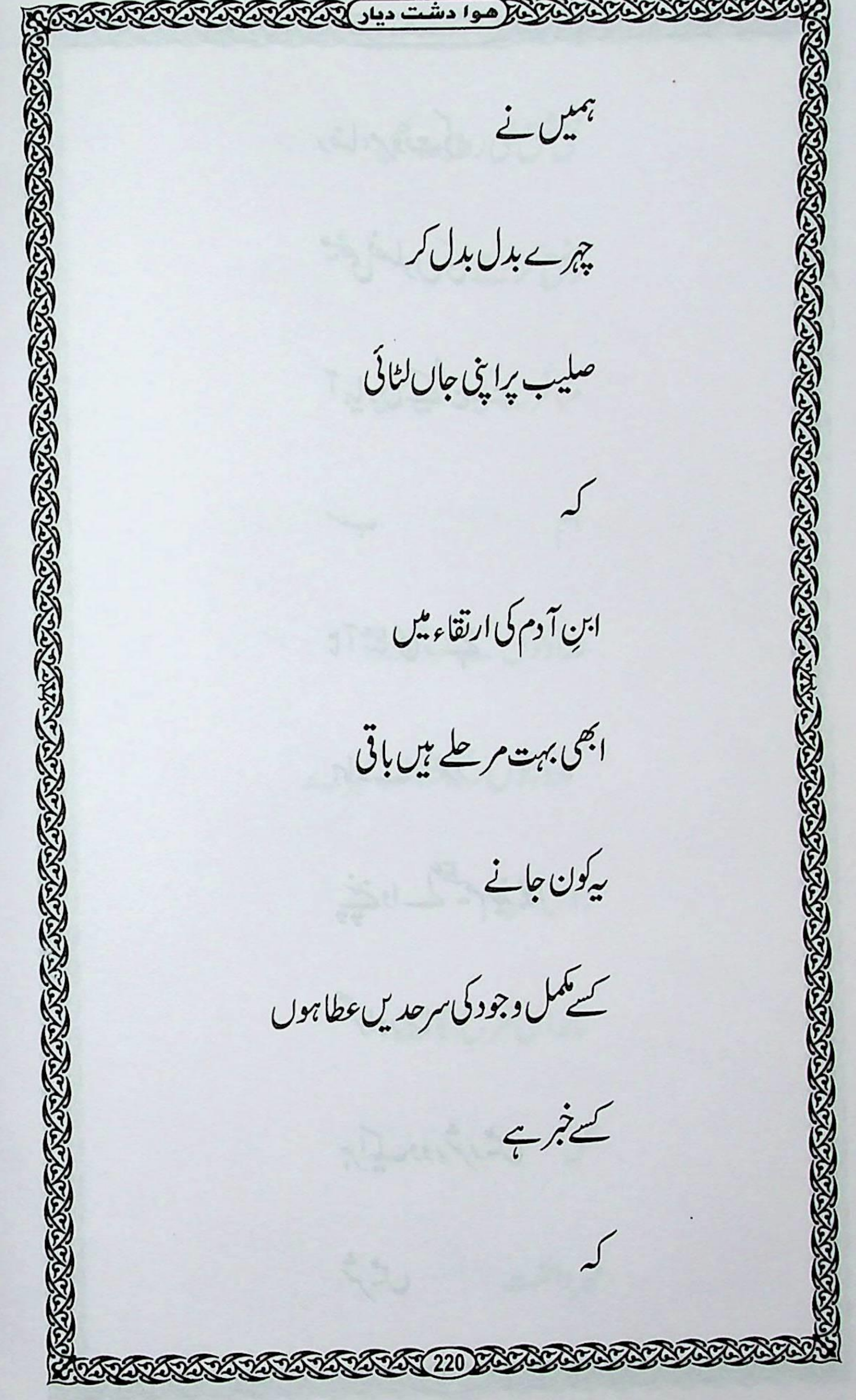
ہمارے اندر

پنپنے والے عظیم جذبو!

گواہ رہنا

ہر ایک دورِ شرر میں

شرر میں



ہمیں نے

چہرے بدل بدل کر

صلیب پر اپنی جاں لٹائی

کہ

ابنِ آدم کی ارتقاء میں

ابھی بہت مرحلے ہیں باقی

یہ کون جانے

کسے مکمل وجود کی سرحدیں عطا ہوں

کسے خبر ہے

کہ

خارزاروں میں

کن کے ہاتھوں میں خار ہونگے

کہ

ہم نہ ہونگے

تو

زندگانی کی خواب ایسی حقیقتوں کے گداز صدمو

گواہ رہنا

کہ

ہم دوبارہ نہ جنم لینگے ۔۔۔!

ہونی

اور

پھراس رات

اُس

آدھے ادھورے آدمی نے میری

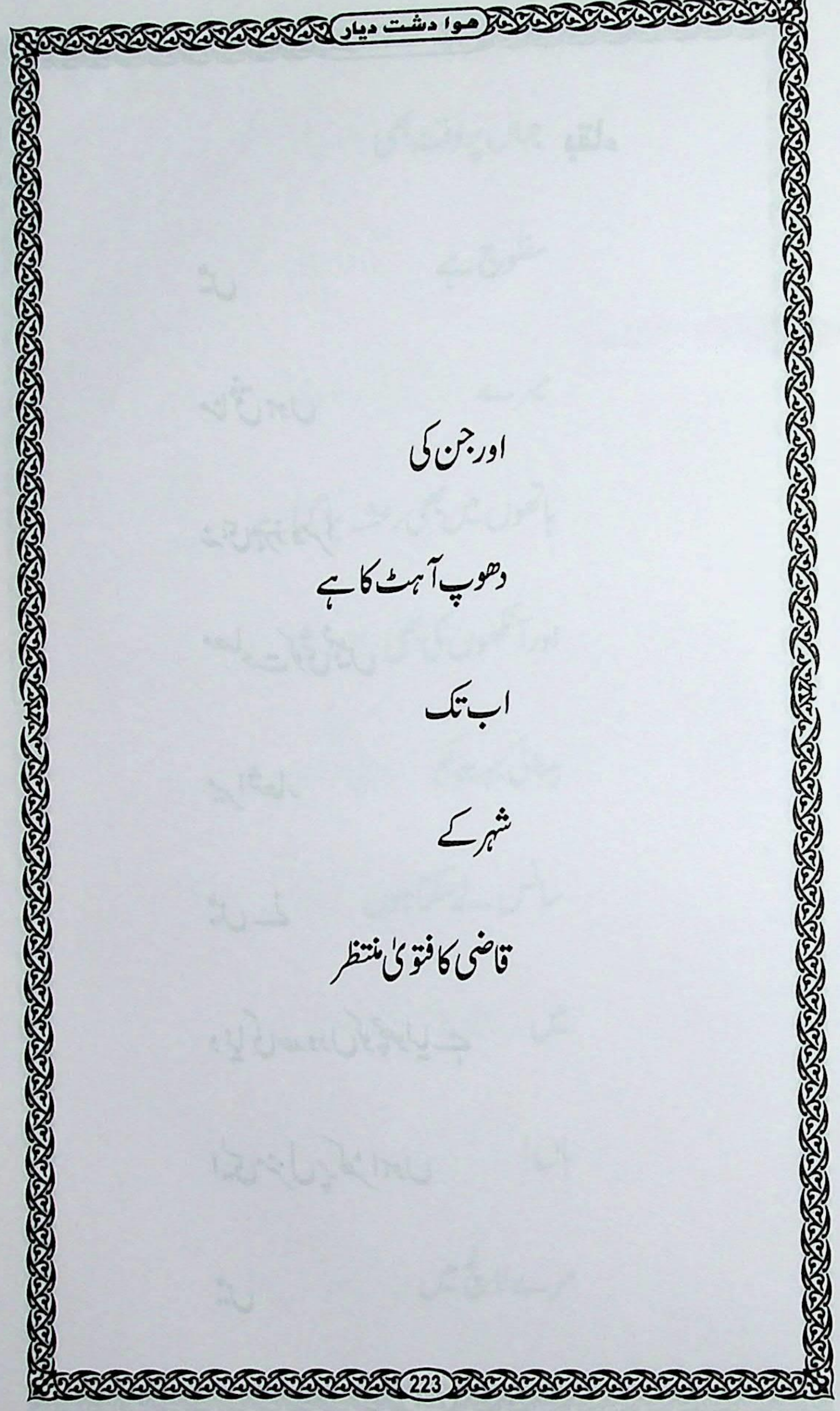
مردہ کوکھ میں

کچھ پھول چہرے

چاند جھومر

بودئے تھے

جن کی خوشبو



اور جن کی

دھوپ آہٹ کا ہے

اب تک

شہر کے

قاضی کا فتویٰ منتظر

بقاء

میں

منافق ہوں

نہ ہی ہرزہ سرا

مصلحت کوشی نہیں

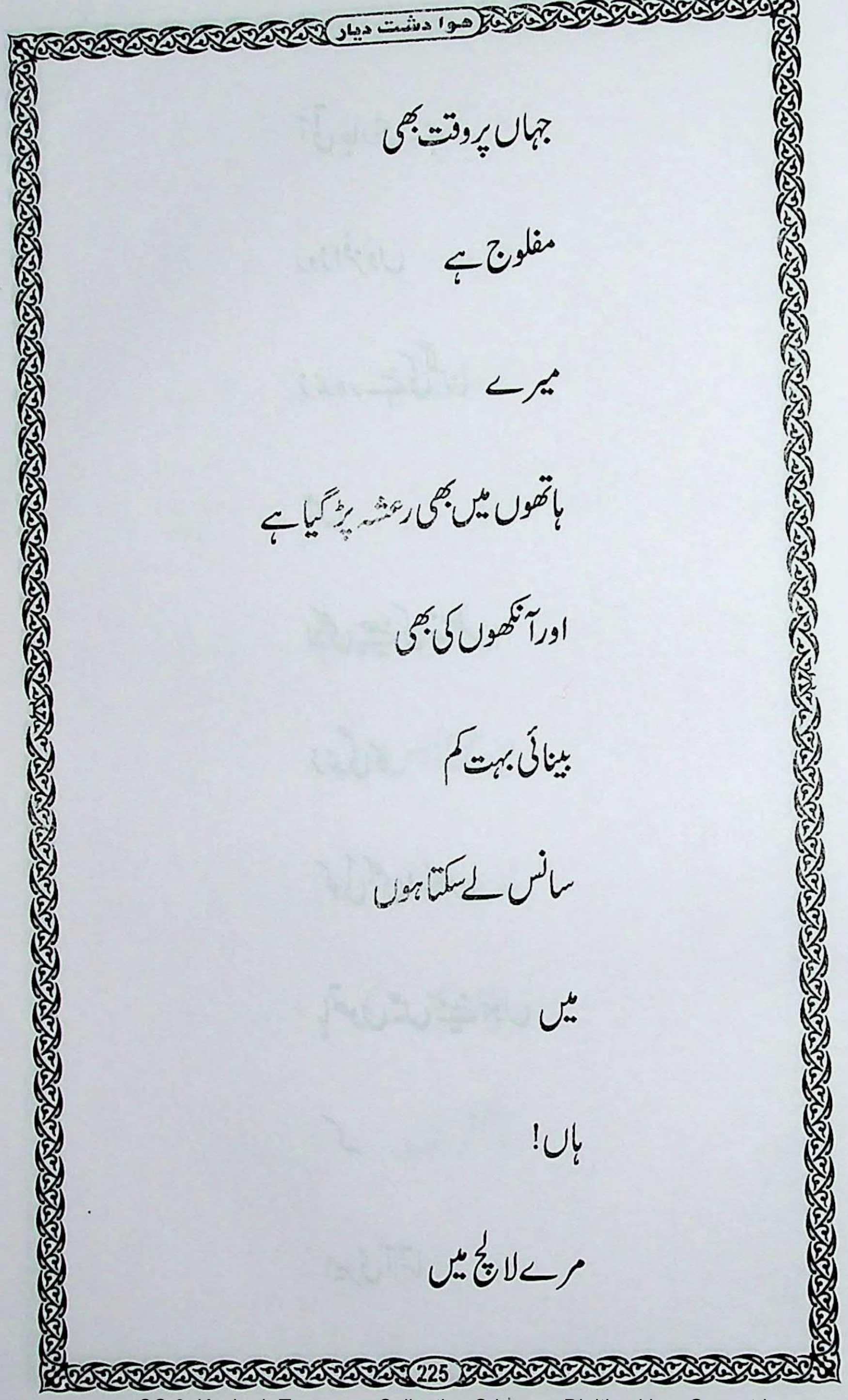
میرا شعار

میں نے

دنیا کی حدودں کو چھولیا ہے

ایسی منزل پر کھڑا ہوں

میں



جہاں پر وقت بھی

مفلوج ہے

میرے

ہاتھوں میں بھی رعشہ پڑ گیا ہے

اور آنکھوں کی بھی

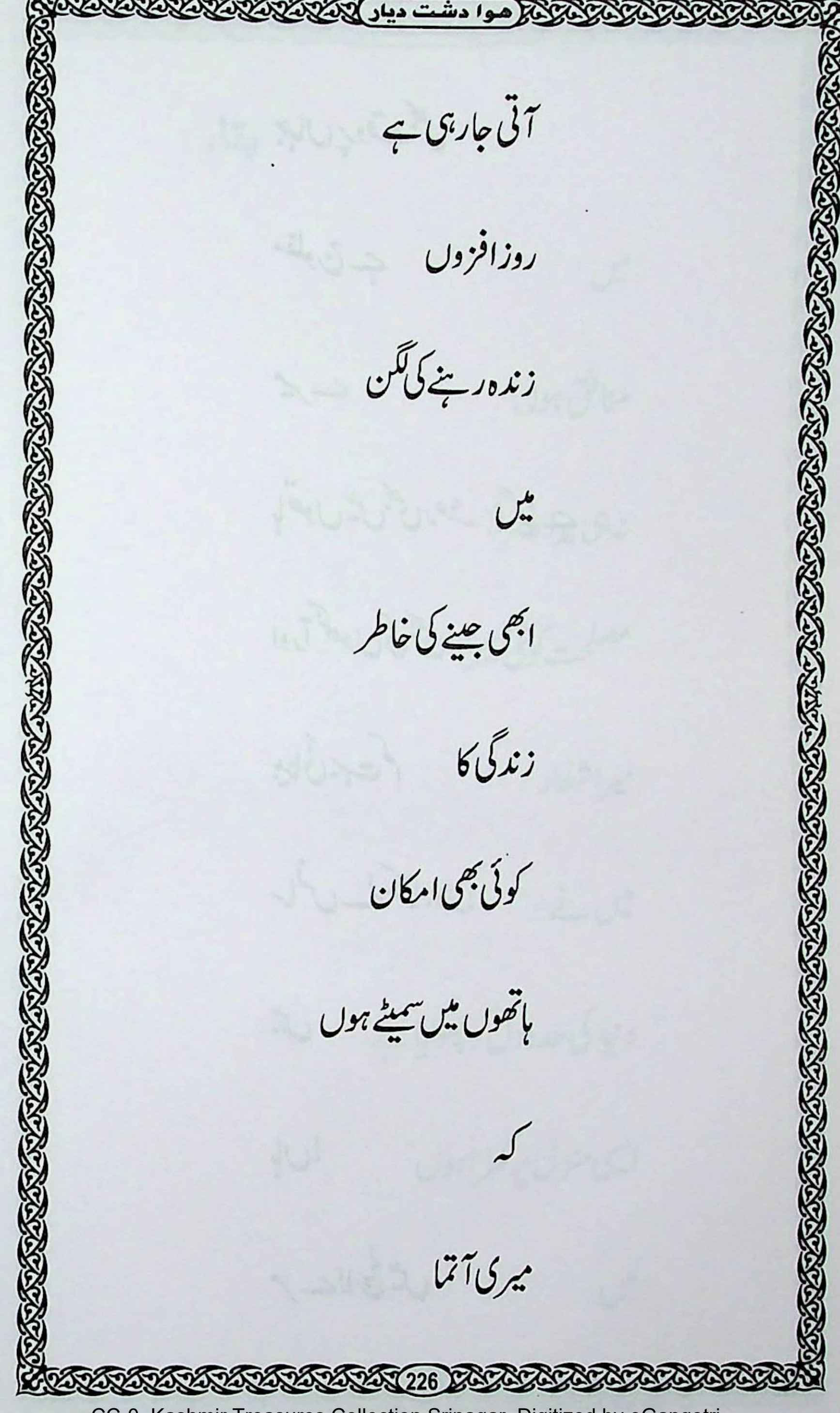
بینائی بہت کم

سانس لے سکتا ہوں

میں

ہاں!

مرے لالچ میں



آتی جا رہی ہے

روز افزوں

زندہ رہنے کی لگن

میں

ابھی جینے کی خاطر

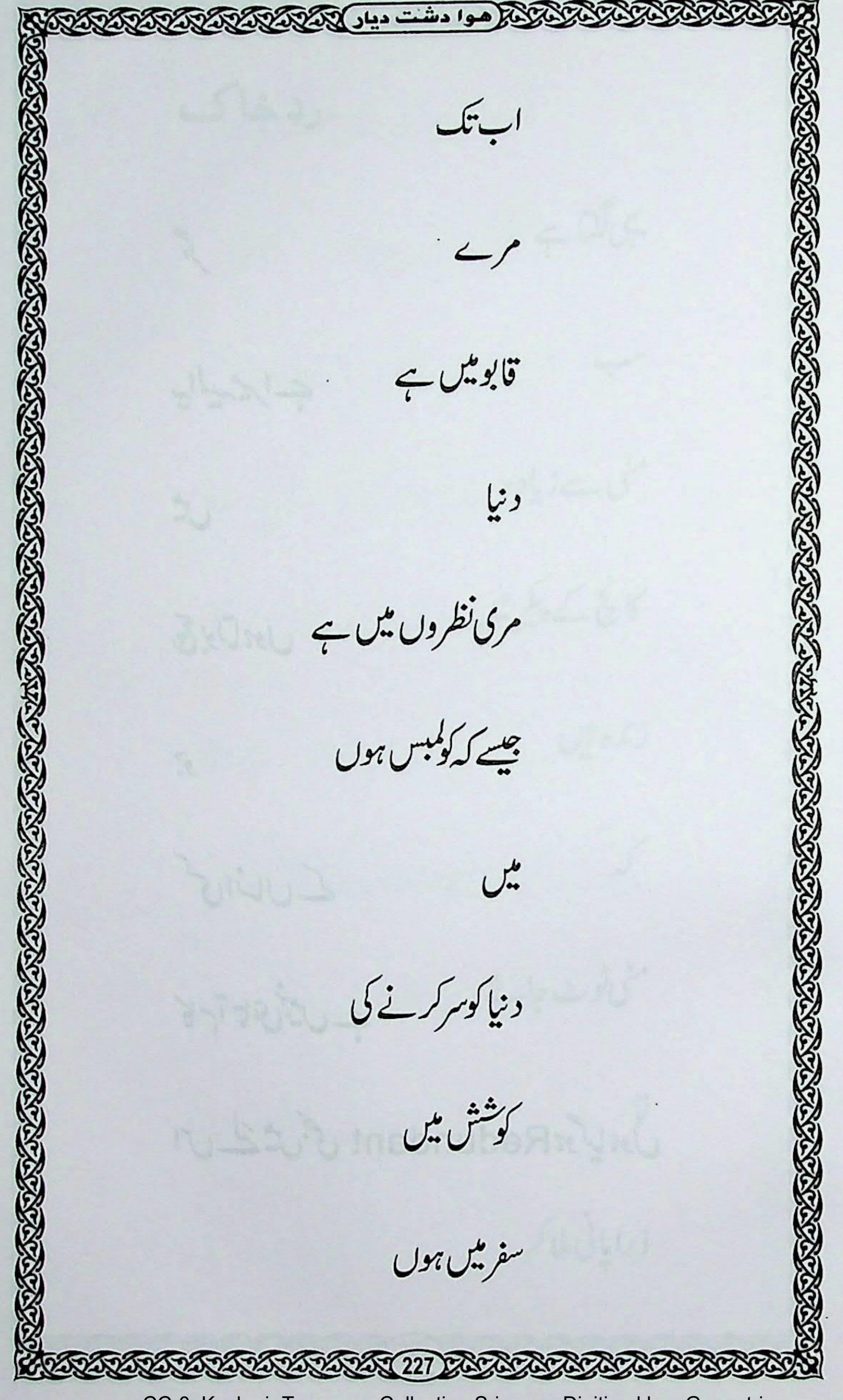
زندگی کا

کوئی بھی امکان

ہاتھوں میں سمیٹے ہوں

کہ

میری آتما



اب تک

مرے

قابو میں ہے

دنیا

مری نظروں میں ہے

جیسے کہ کو ملبس ہوں

میں

دنیا کو سر کرنے کی

کوشش میں

سفر میں ہوں

مگر

یہ المیہ میرا ہے

میں

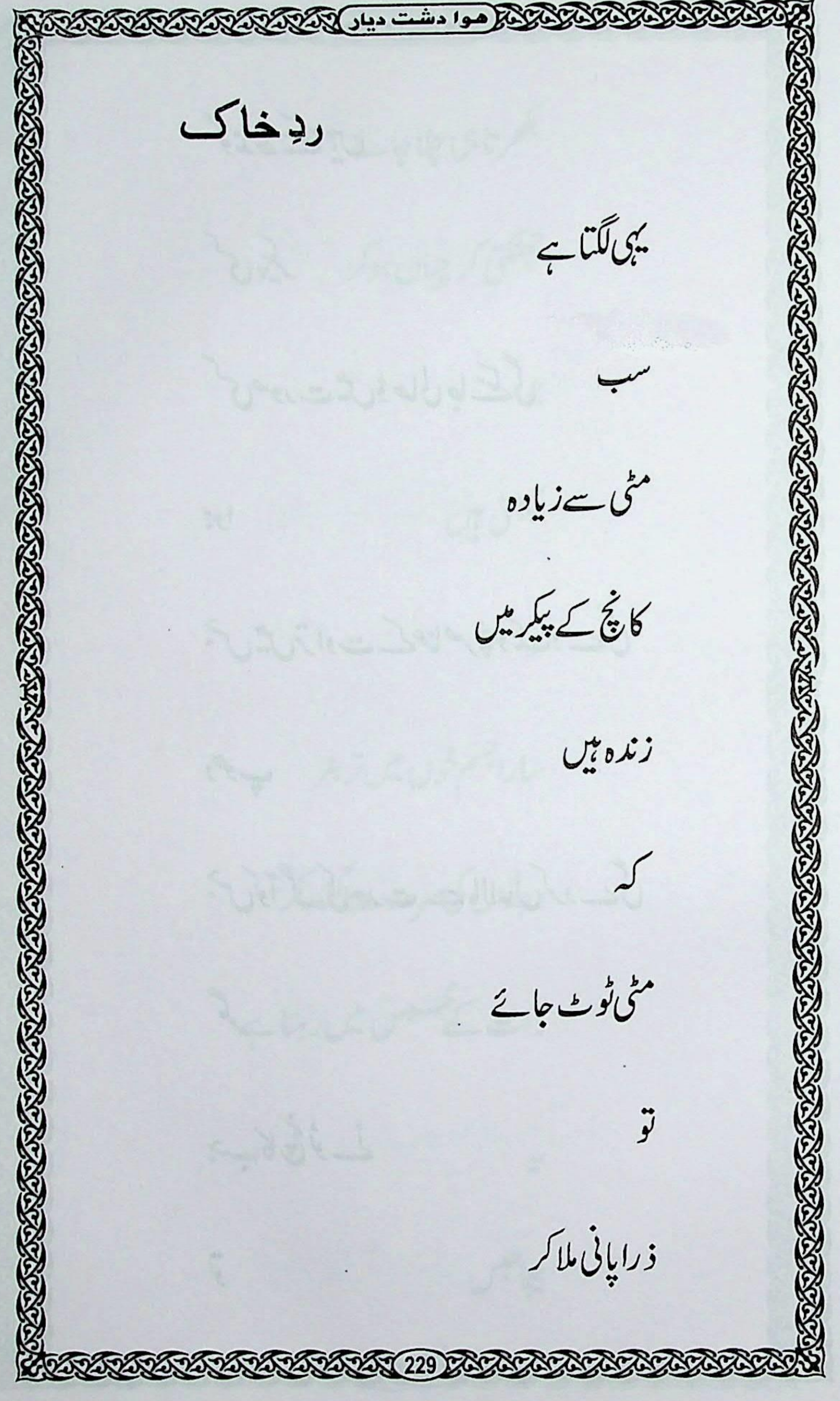
سچ بولتا ہوں

جو

کسی انساں کے

کام آتا ہی نہیں ہے

اس لئے میں بھی Redundant ہو گیا ہوں



ردِ خاک

یہی لگتا ہے

سب

مٹی سے زیادہ

کانچ کے پیکر میں

زندہ ہیں

کہ

مٹی ٹوٹ جائے

تو

ذرا پانی ملا کر

گوندھ سکتے ہیں

کسی پیکر

کسی صورت میں ڈھالی جا سکے گی

ہوا

جس میں تراوت کے عناصر پھونک دے گی

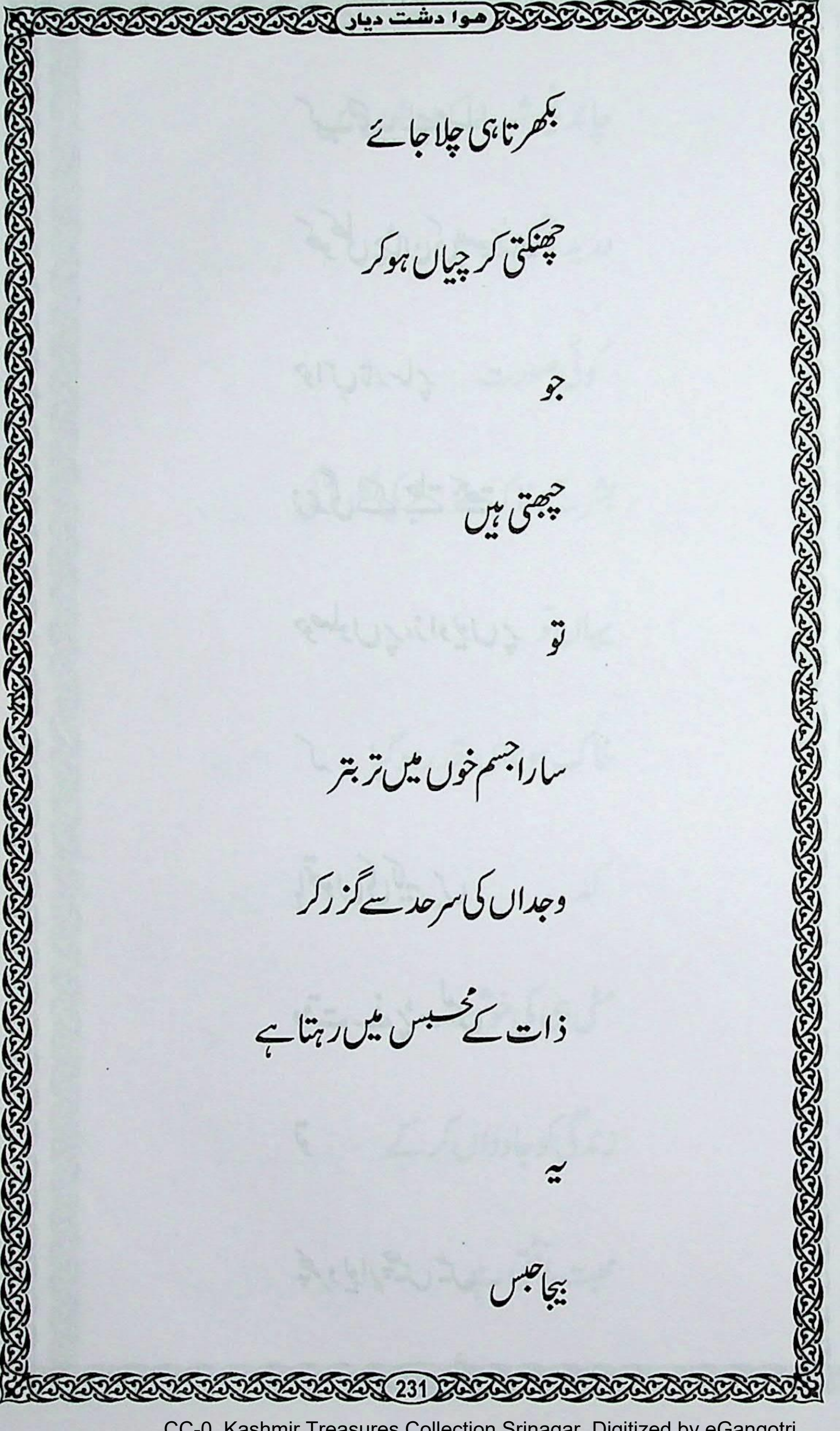
دھوپ

جس کو آگ کی حدت سے مالا مال کر دے گی

مگر

جب کانچ ٹوٹے

تو



بکھرتا ہی چلا جائے

چھنکتی کرچیاں ہوکر

جو

چبھتی ہیں

تو

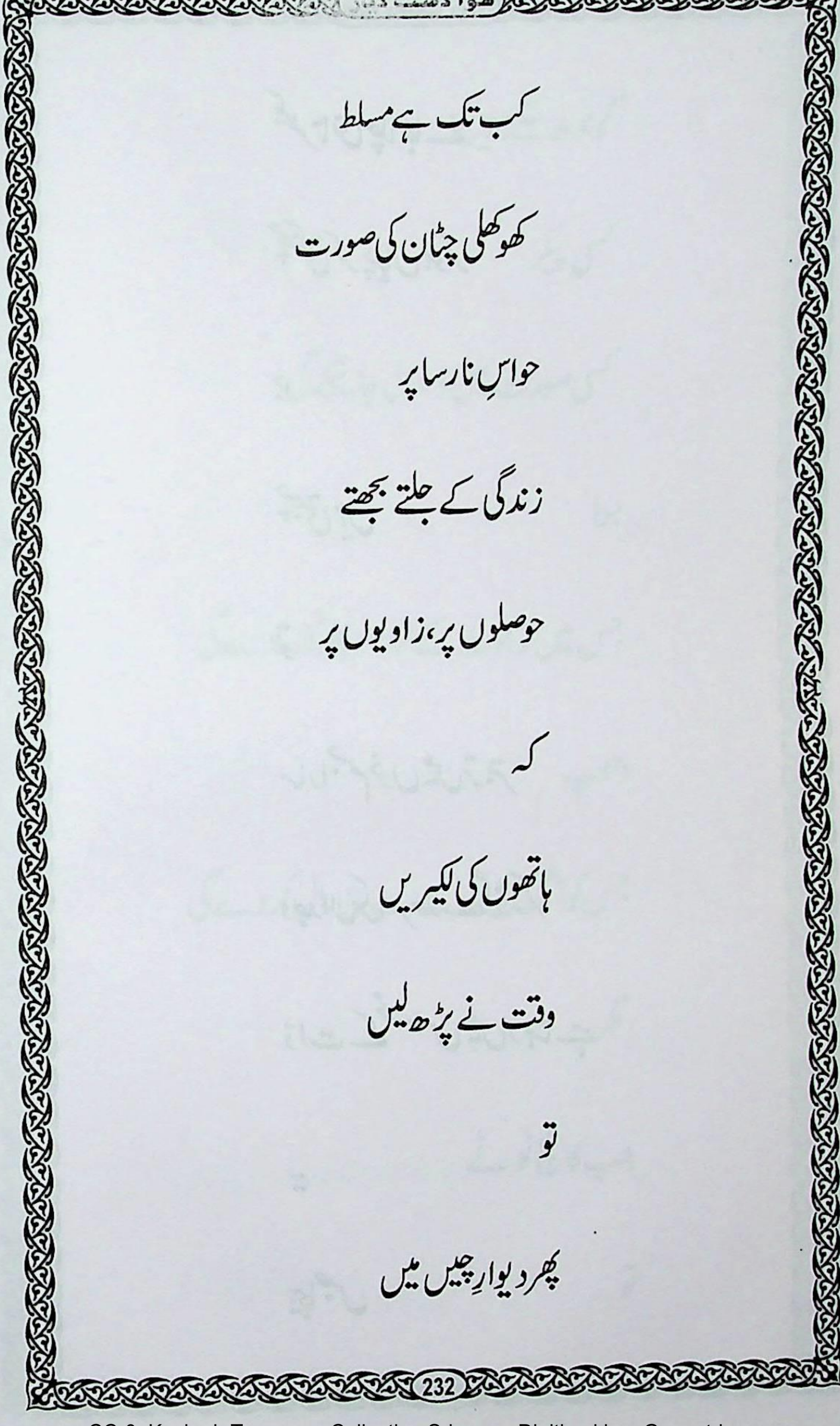
سارا جسم خوں میں تر بتر

وجداں کی سرحد سے گزر کر

ذات کے محبس میں رہتا ہے

یہ

بیجا حبس



کب تک ہے مسلط

کھوکھلی چٹان کی صورت

حواسِ نارسا پر

زندگی کے جلتے بجھتے

حوصلوں پر، زاویوں پر

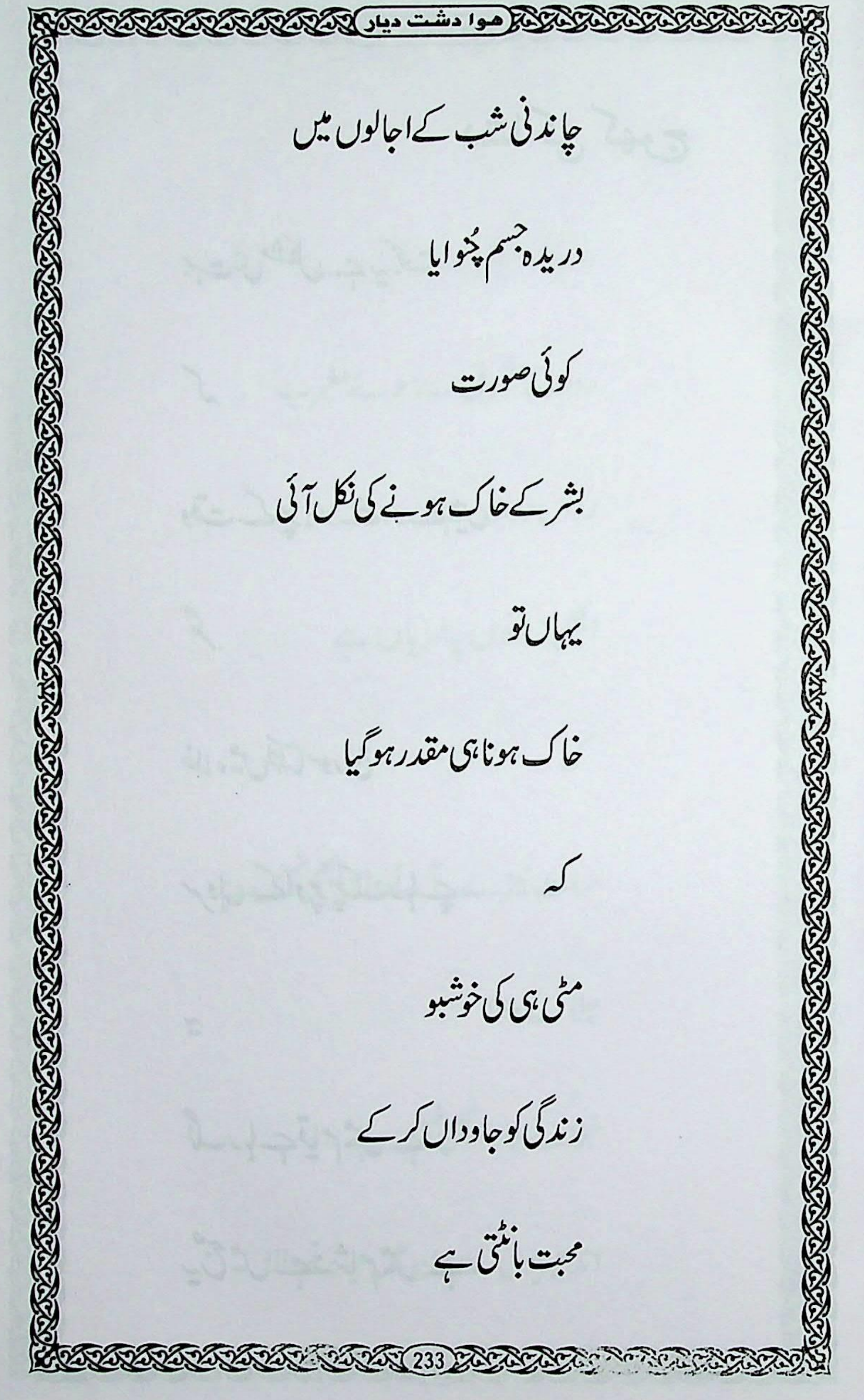
کہ

ہاتھوں کی لکیریں

وقت نے پڑھ لیں

تو

پھر دیوارِ چیں میں



چاندنی شب کے اجالوں میں

دریدہ جسم چھو آیا

کوئی صورت

بشر کے خاک ہونے کی نکل آئی

یہاں تو

خاک ہونا ہی مقدر ہو گیا

کہ

مٹی ہی کی خوشبو

زندگی کو جاوداں کر کے

محبت بانٹتی ہے

دشا کی کھوج

بہت ہی مشکل ہے یہ سمجھنا

کہ

وقت کے پر بندھے ہوئے ہیں

مگر

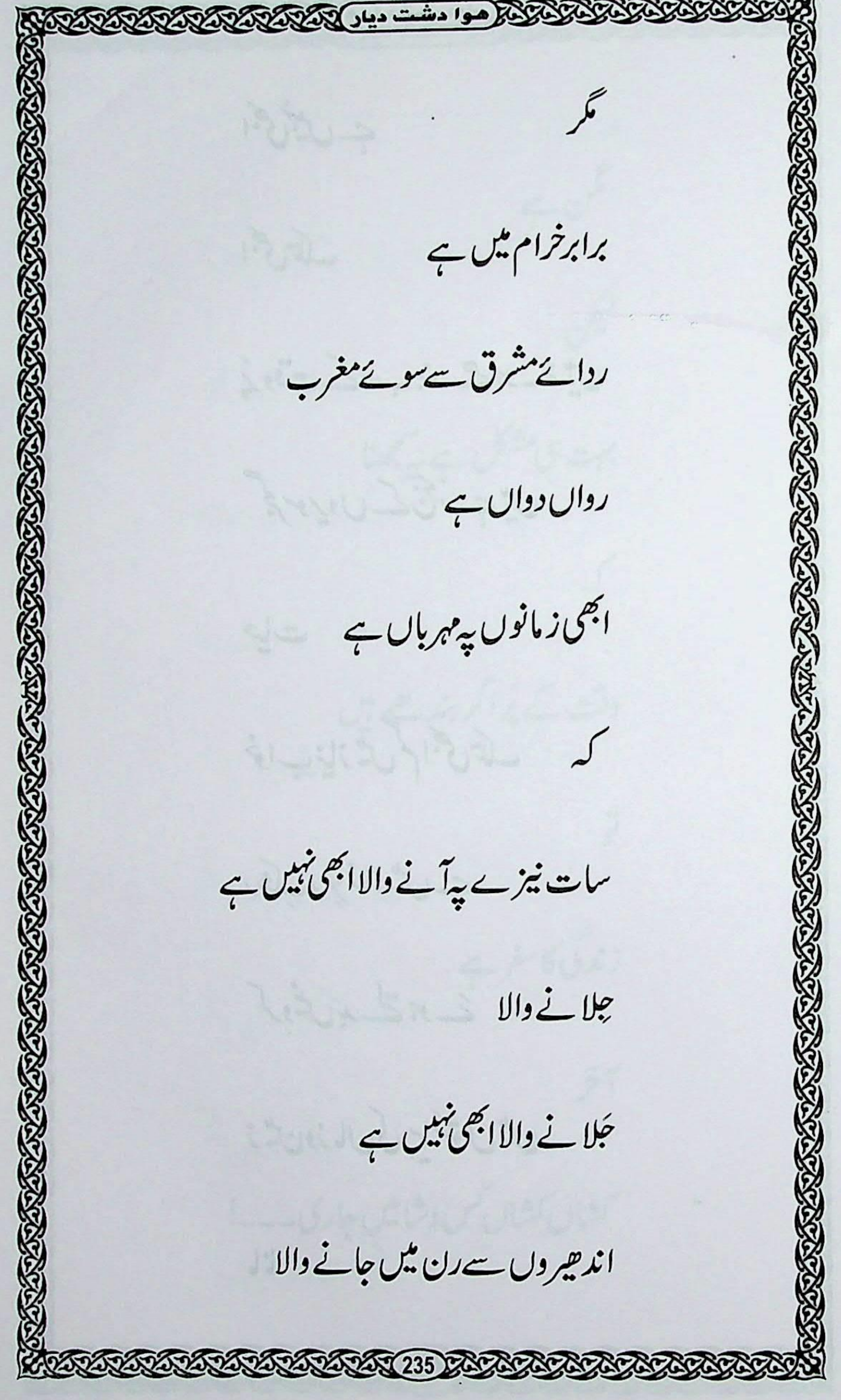
خلاء میں لٹکتا سورج

سروں کے اوپر چمک رہا ہے

یہ

لگ رہا ہے قیام میں ہے

یہ صبح میں ہے نہ شام میں ہے



مگر

برابر خرام میں ہے

ردائے مشرق سے سوئے مغرب

رواں دواں ہے

ابھی زمانوں پہ مہرباں ہے

کہ

سات نیزے پہ آنے والا ابھی نہیں ہے

جِلانے والا

جَلانے والا ابھی نہیں ہے

اندھیروں سے رن میں جانے والا

ابھی نہیں ہے

ابھی تلک

پَر وقت کے سب بندھے ہوئے ہیں

گجر سویروں کے بج رہے ہیں

حیات

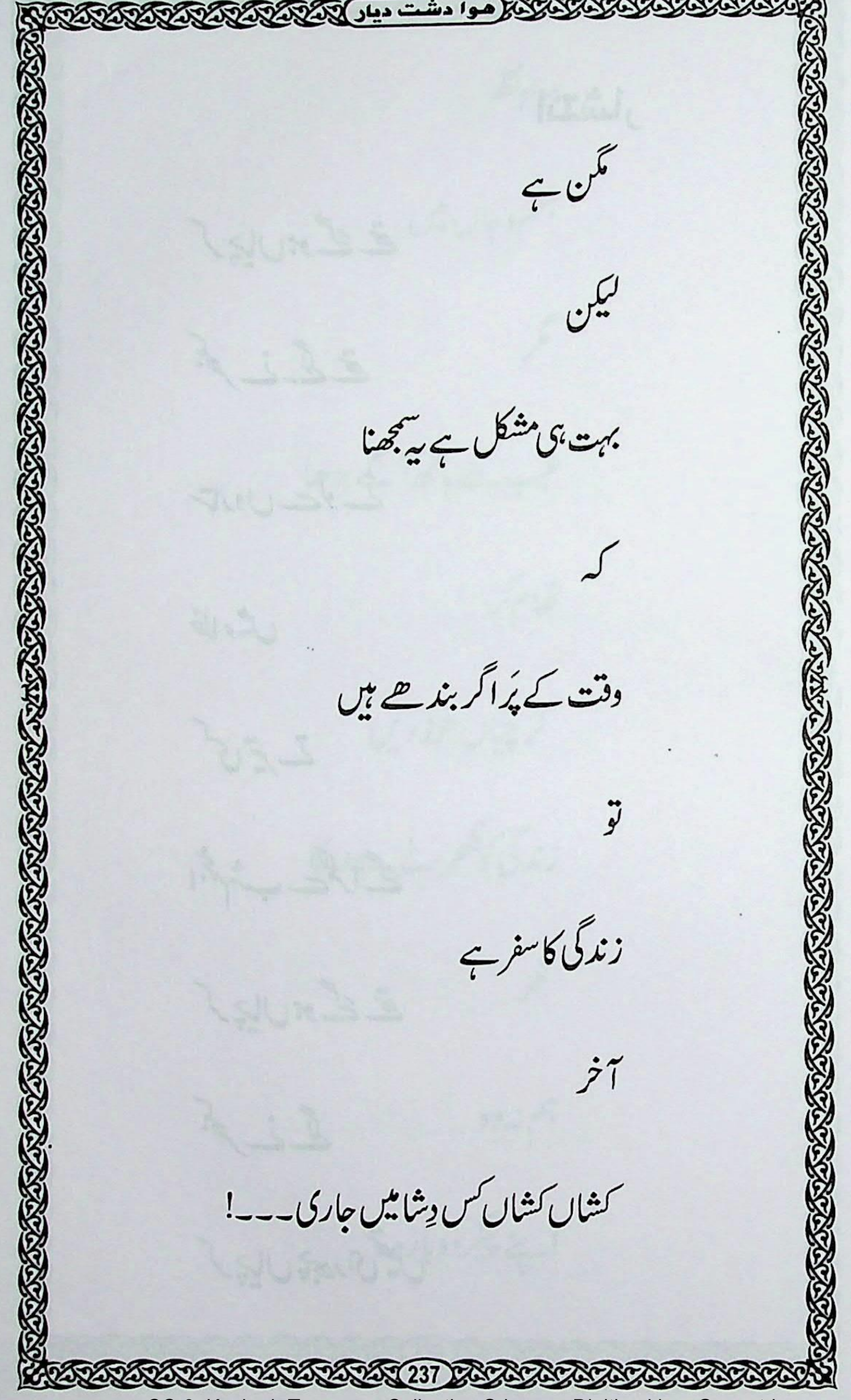
خوابِ نیاز میں گُم ابھی تلک

رشکِ رمزِ نماز میں ہے

کروٹیں بدلتے ہوئے

زمین و زماں کی پیمائشوں میں

مانا



مگن ہے

لیکن

بہت ہی مشکل ہے یہ سمجھنا

کہ

وقت کے پَر اگر بندھے ہیں

تو

زندگی کا سفر ہے

آخر

کشاں کشاں کس دِشا میں جاری۔۔۔!

انتشار

کرچیاں ہو گئے تھے

بکھرنے لگے تھے

ستاروں سے لوٹے

خلاء میں

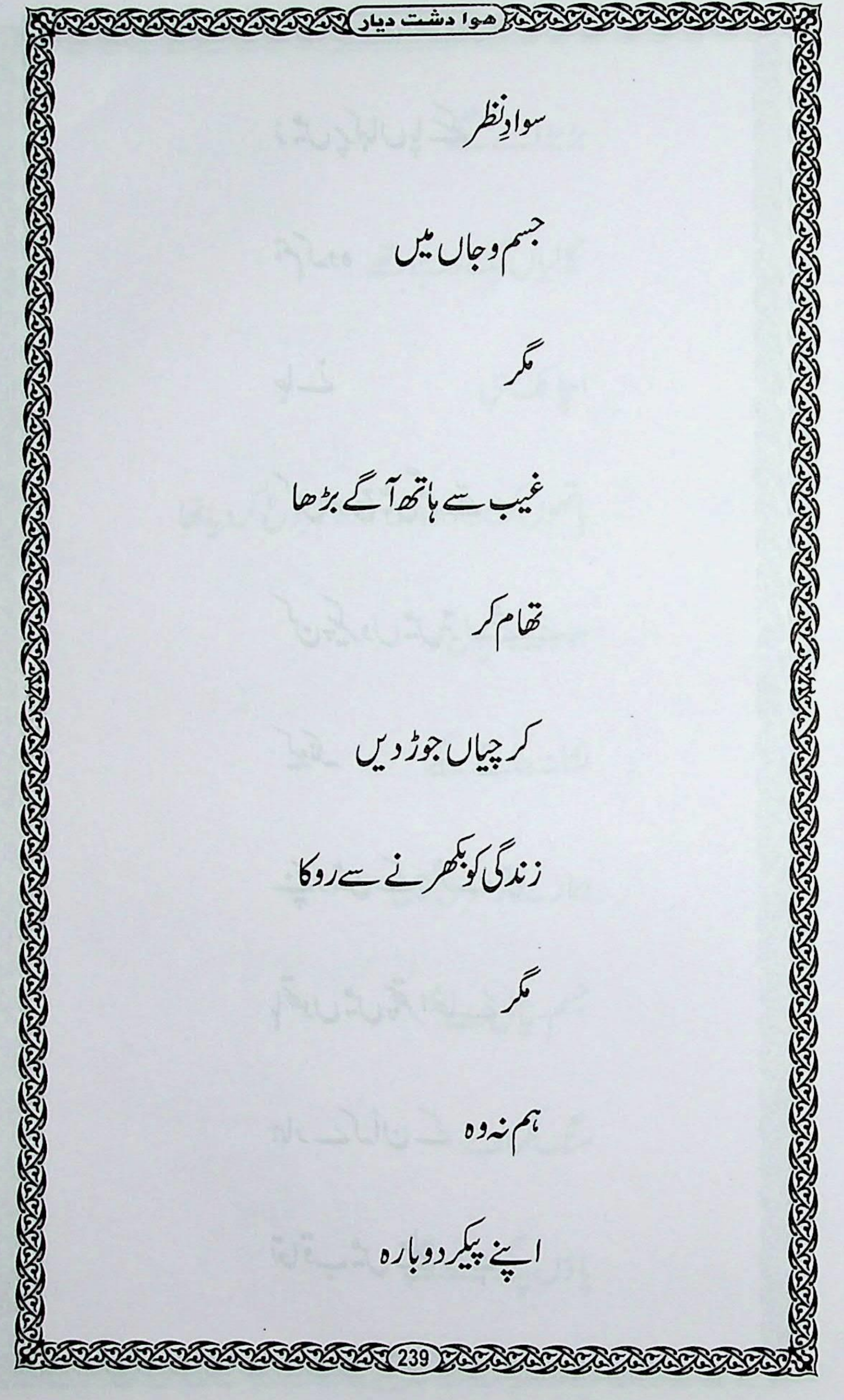
کسی تیرتے

انجم شب سے ٹکرا گئے

کرچیاں ہو گئے تھے

بکھرنے لگے

کرچیاں چبھ رہی تھیں



سوادِ نظر

جسم و جاں میں

مگر

غیب سے ہاتھ آگے بڑھا

تھام کر

کرچیاں جوڑ دیں

زندگی کو بکھرنے سے روکا

مگر

ہم نہ وہ

اپنے پیکر دوبارہ

زمیں پر کہاں پا سکے

ہم کہ وہ

جانے

کس سوچ میں گم تھے

کن پیکروں میں تراشے گئے

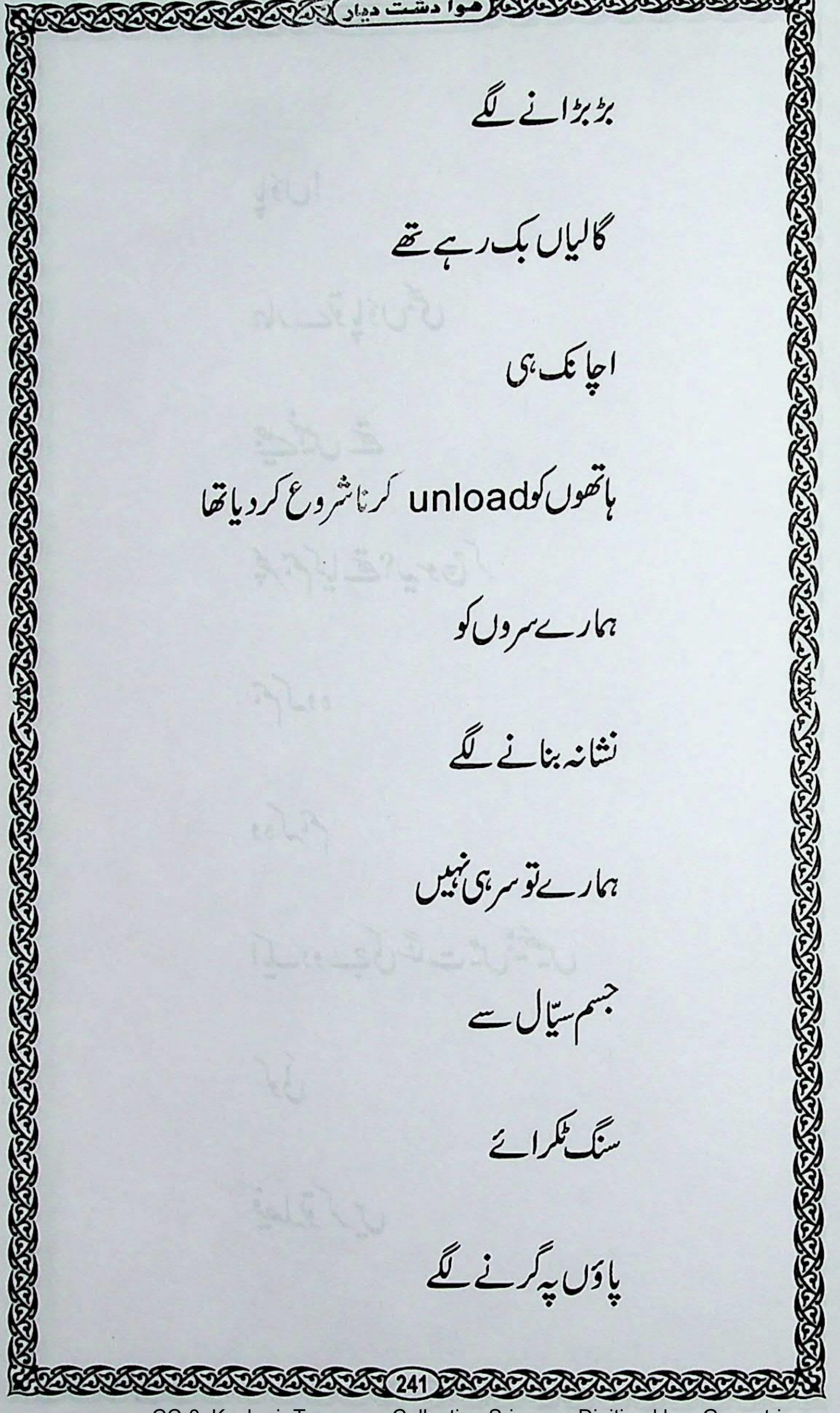
کیونکہ

بچے زمین کے ہمارے ہی

ہاتھوں میں پتھر اٹھائے

ہمارے کہ اُن کے

تعاقب میں چلتے رہے



بڑبڑانے لگے

گالیاں بک رہے تھے

اچانک ہی

ہاتھوں کو unload کرنا شروع کردیا تھا

ہمارے سروں کو

نشانہ بنانے لگے

ہمارے تو سر ہی نہیں

جسم سیّال سے

سنگ ٹکرائے

پاؤں پہ گرنے لگے

پاؤں!

ہمارے تو پاؤں بھی

جیسے نہیں تھے

پھر ہم کیا تھے؟ یہ سوچ کر

ہم کہ وہ

وہ کہ ہم

ایک دوجے کی سنگت میں بیٹھیں

کوئی

فیصلہ تو کریں

حل طلب

بدن ڈھلوان

میں نے

گرتے پڑتے طے تو کی

لیکن

عجب پھسلن مری رگ رگ میں اتری

میں

مچھلی کی طرح پانی سے

جو باہر تڑپتی ہو

تڑپتا سوچنے میں منہمک

مجھ کو

کسی سے شہہ ملی

ہمت ملی مجھ کو

ابھی تو

جسم کی سب چوٹیاں سر کرنی باقی ہیں

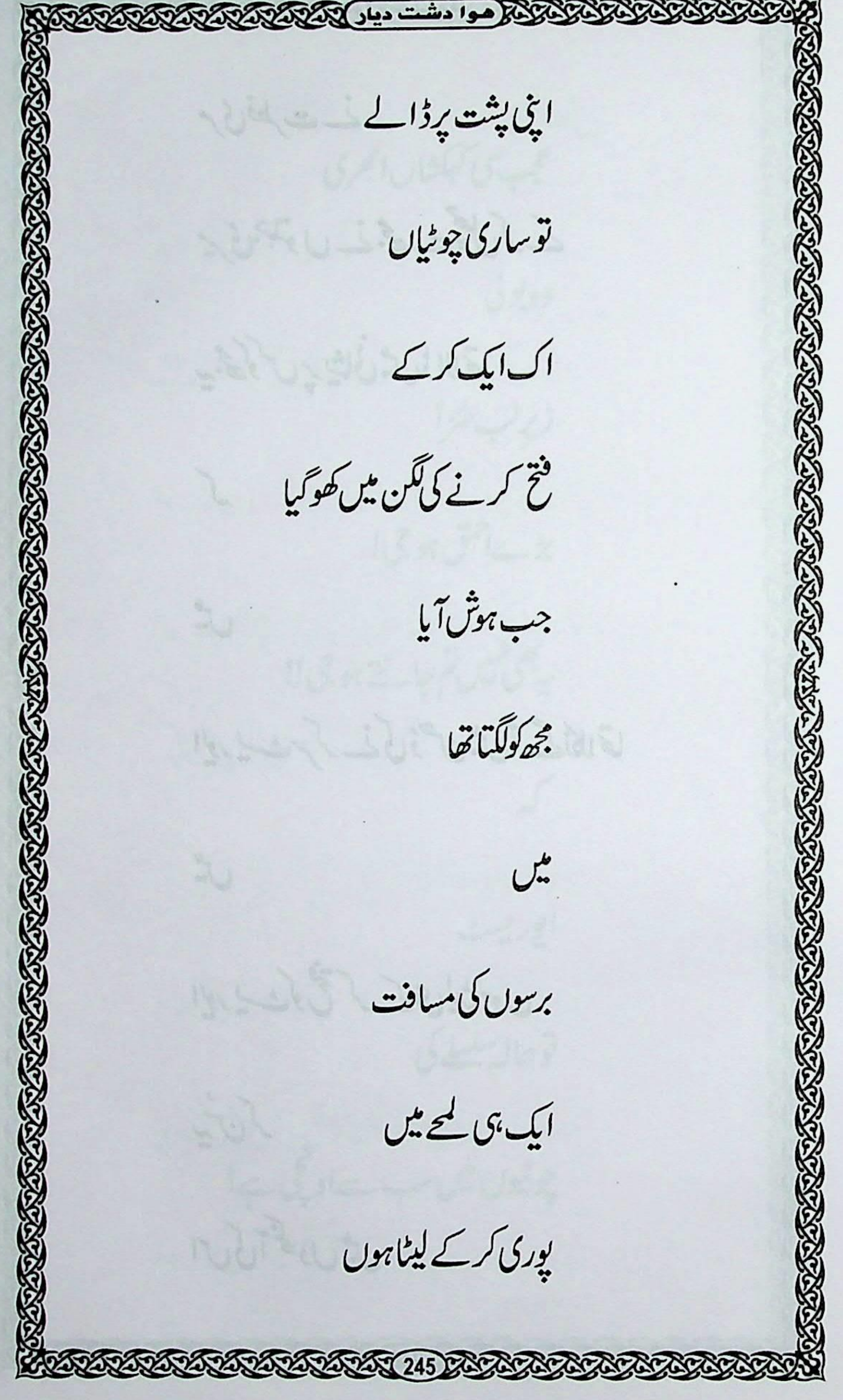
تو

میں نے رسیاں

کچھ سیڑھیاں کُھلتی ہوئیں

اور بند بھی ہوتی ہوئیں

لوہے کی کیلیں اور کچھ اوزار



اپنی پشت پر ڈالے

تو ساری چوٹیاں

اک ایک کر کے

فتح کرنے کی لگن میں کھو گیا

جب ہوش آیا

مجھ کو لگتا تھا

میں

برسوں کی مسافت

ایک ہی لمحے میں

پوری کر کے لیتا ہوں

مری فطرت نے

میری جبلتوں نے مجھ سے چھل کر کے

یہ مجھ کو کس پریشانی میں ڈالا تھا

کہ

میں

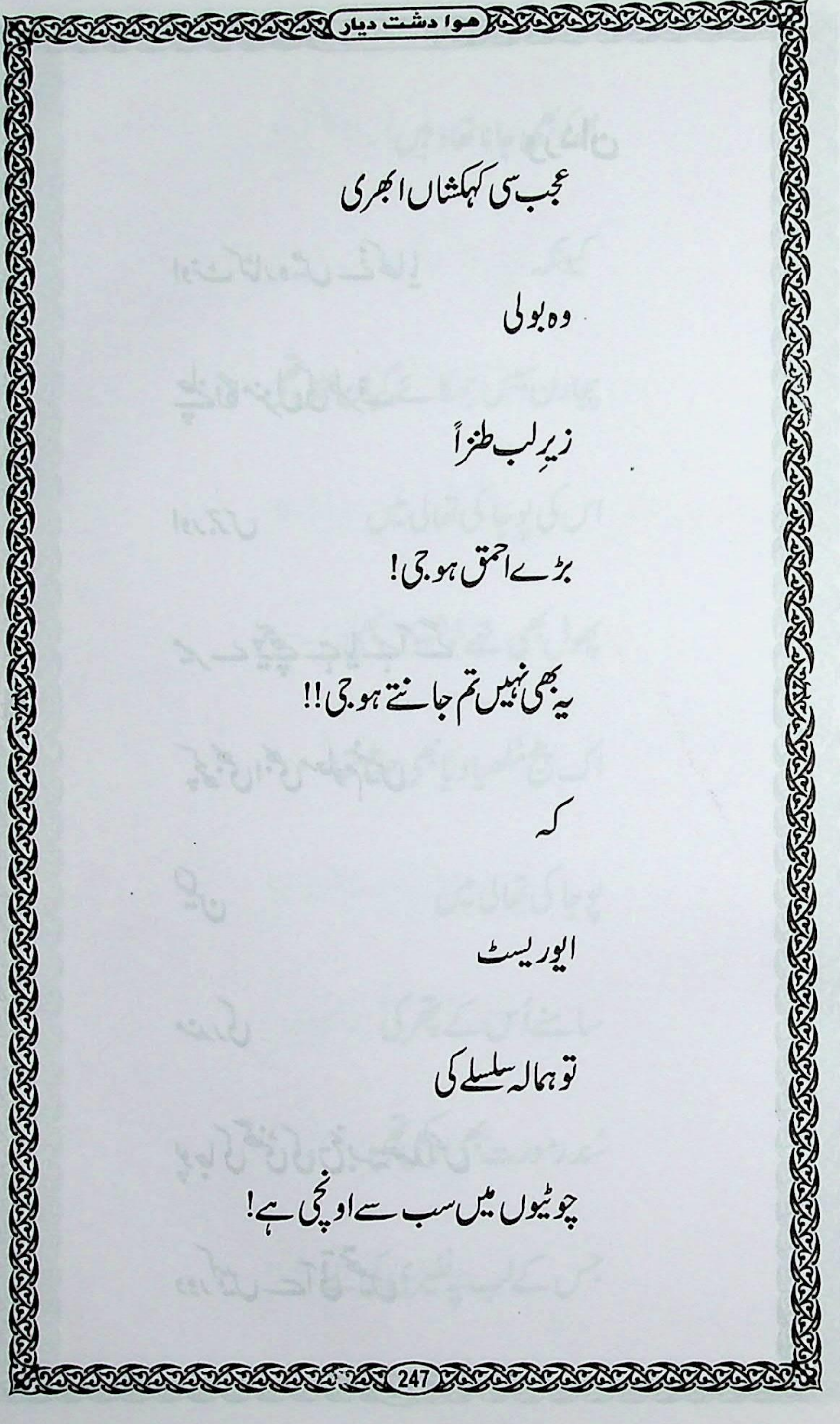
ایوریسٹ سر کرنے کی دُھن میں آگے نکلا تھا

میں

ایوریسٹ کو فتح کر کے ہی لیٹا ہوں

یہ سُن کر

اس کی آنکھوں میں



عجب سی کہکشاں ابھری

وہ بولی

زیرِ لب طنزاً

بڑے احمق ہو جی!

یہ بھی نہیں تم جانتے ہو جی!!

کہ

ایوریسٹ

توہمالہ سلسلے کی

چوٹیوں میں سب سے اونچی ہے!

وردان

اونٹ کٹارہ میں نے کھایا

چلنے لگا منزل کی طرف

اور جرس

میرے پیچھے ہے یا ہے آگے

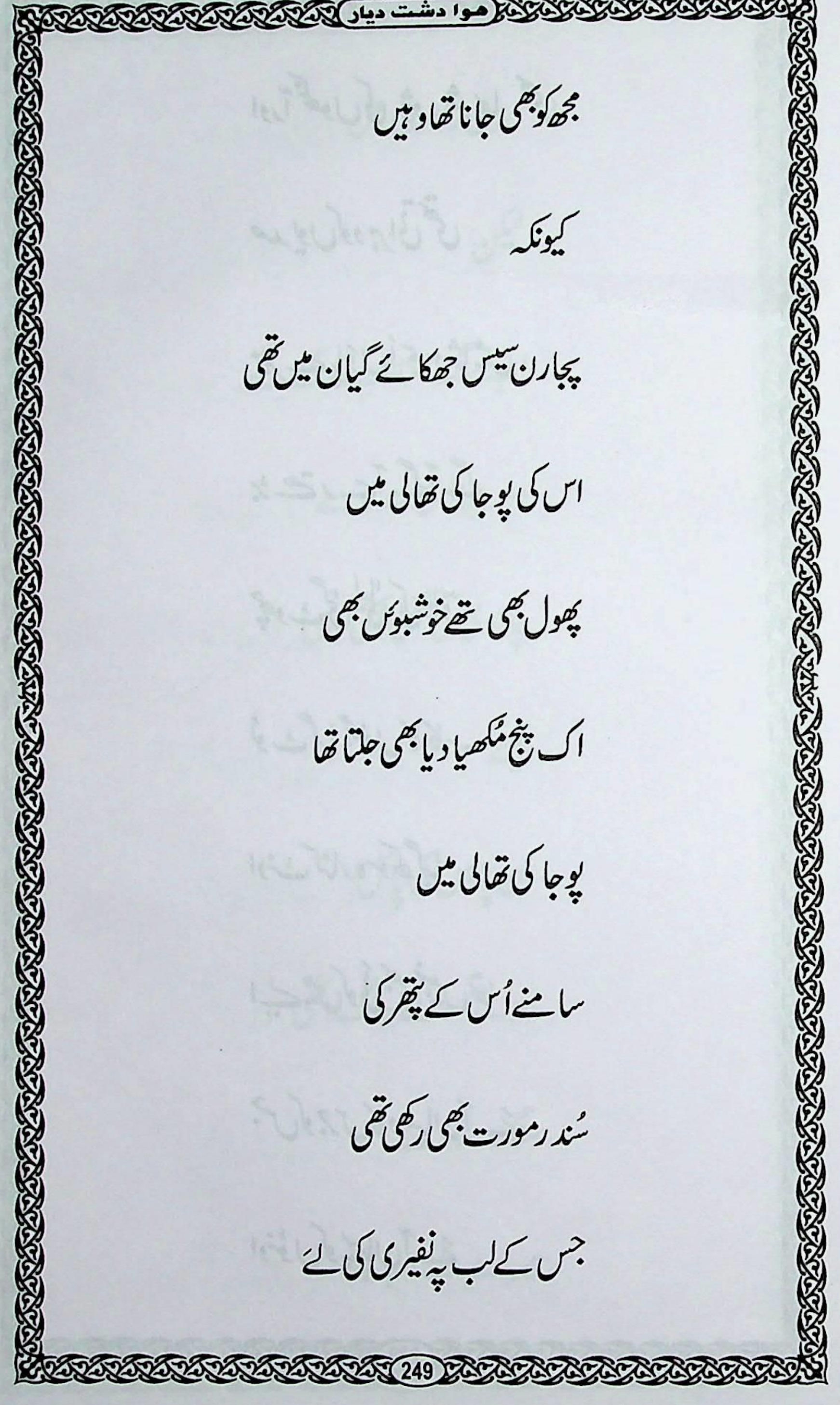
کچھ بھی ابھی معلوم نہیں

لیکن

مندر کی

پوجا کی گھنٹی کی یخ بستہ صدائیں

دور کہیں سے آتی تھیں



مجھ کو بھی جانا تھا وہیں

کیونکہ

پجارن سیس جھکائے گیان میں تھی

اس کی پوجا کی تھالی میں

پھول بھی تھے خوشبوئیں بھی

اک پنچ مُکھیا دیا بھی جلتا تھا

پوجا کی تھالی میں

سامنے اُس کے پتھر کی

سُندر مورت بھی رکھی تھی

جس کے لب پہ نفیری کی لَے

اور آنکھوں کی شِو شوبھا بھی

صدیوں کو دہراتی تھی

میرے پاؤں اُسی دشا میں

بڑھتے رہے آگے آگے

چھوٹ گئی لیلیٰ کی ناقہ

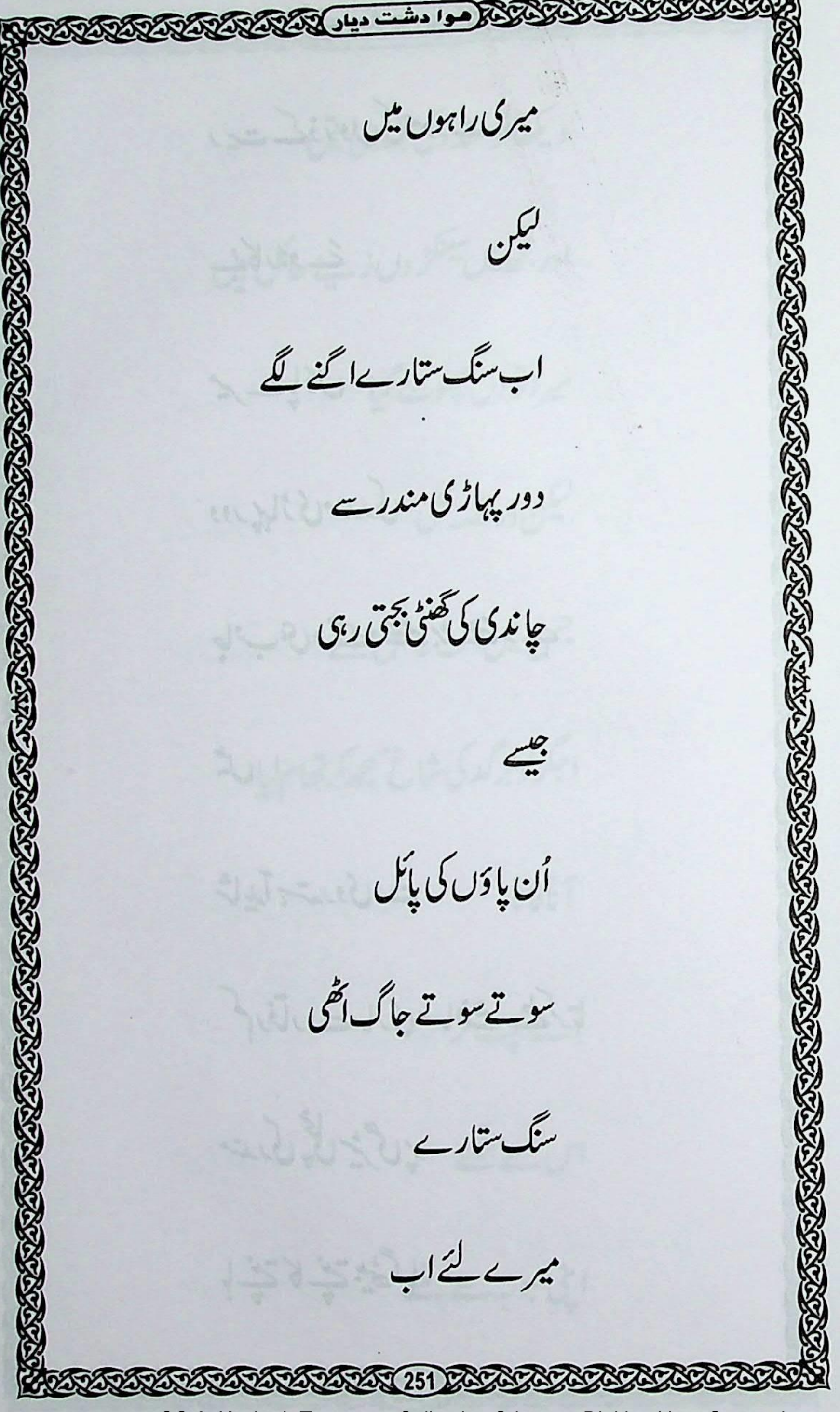
ٹوٹ گیا مجنوں کا کاسہ

اونٹ کٹارہ سوکھ گیا

ایسے میں کوئی بھی نہیں تھا

جس کو جرس کا دھیان آئے

اونٹوں کو پہچان آئے



میری راہوں میں

لیکن

اب سنگ ستارے اگنے لگے

دور پہاڑی مندر سے

چاندی کی گھنٹی بجتی رہی

جیسے

اُن پاؤں کی پائل

سوتے سوتے جاگ اٹھی

سنگ ستارے

میرے لئے اب

ریت کے ذرّوں کی صورت

بے کار ہوئے

میرے پاؤں

دور پہاڑی مندر کی

جانب ہی دھیمے دھیمے بڑھتے رہے

میں

شاید آہستہ روی سے

کم رفتار سے ساری مسافت طے کرتا

مندر کی نچلی سیڑھی پر

ہانپتے کانپتے بیٹھ گیا

دیکھا تو مندر کی بلندی میں

اور مجھ میں سینکڑوں زینے حائل ہیں

میرا تو دل چھوٹ گیا

لیکن وہ قصہ بھی

جس میں اک عاشق نے

اجگر کو برگد کی شاخ سمجھ کر تھام لیا

آناً فاناً

اِسے لپٹ کر

اس سے لٹکتے

اپنی محبوبہ سے ملنے

اس کے کمرے کی کھڑکی تک جا پہنچا

یاد آیا

میرے ہاتھ میں اجگر تھا اور نہ تھی برگد کی شاخ

گرتے پڑتے میں آخر مندر کے دوار تک آ پہنچا

سامنے پتھر کی مورت تھی

کیسر بدن میں لپٹی پجارن

ہاتھوں میں پوجا کی تھالی

سیس جھکائے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی

میرا ہاتھ اچانک

مندر کے مکھیہ دروازے پر

لٹکتی گھنٹی سے ٹکرایا

ٹن ٹنن، ٹن ٹن، ٹنن، ٹن کی

میٹھی آوازوں سے ساری فضا

مسحور ہوئی

اس نے پلٹ کر دیکھا

اک پل کی تاخیر نہ کی

مورت کے چرنوں میں اس نے پوجا کی تھالی رکھ دی

ہاتھ مرے ہاتھوں میں دئے

جیسے یگوں سے پیاسی تھی

اچنبھا

دِیویُوں دِیوتاؤں نے

وردان جیون کا دیکر

بڑے

چکرو یومیں پھنسایا

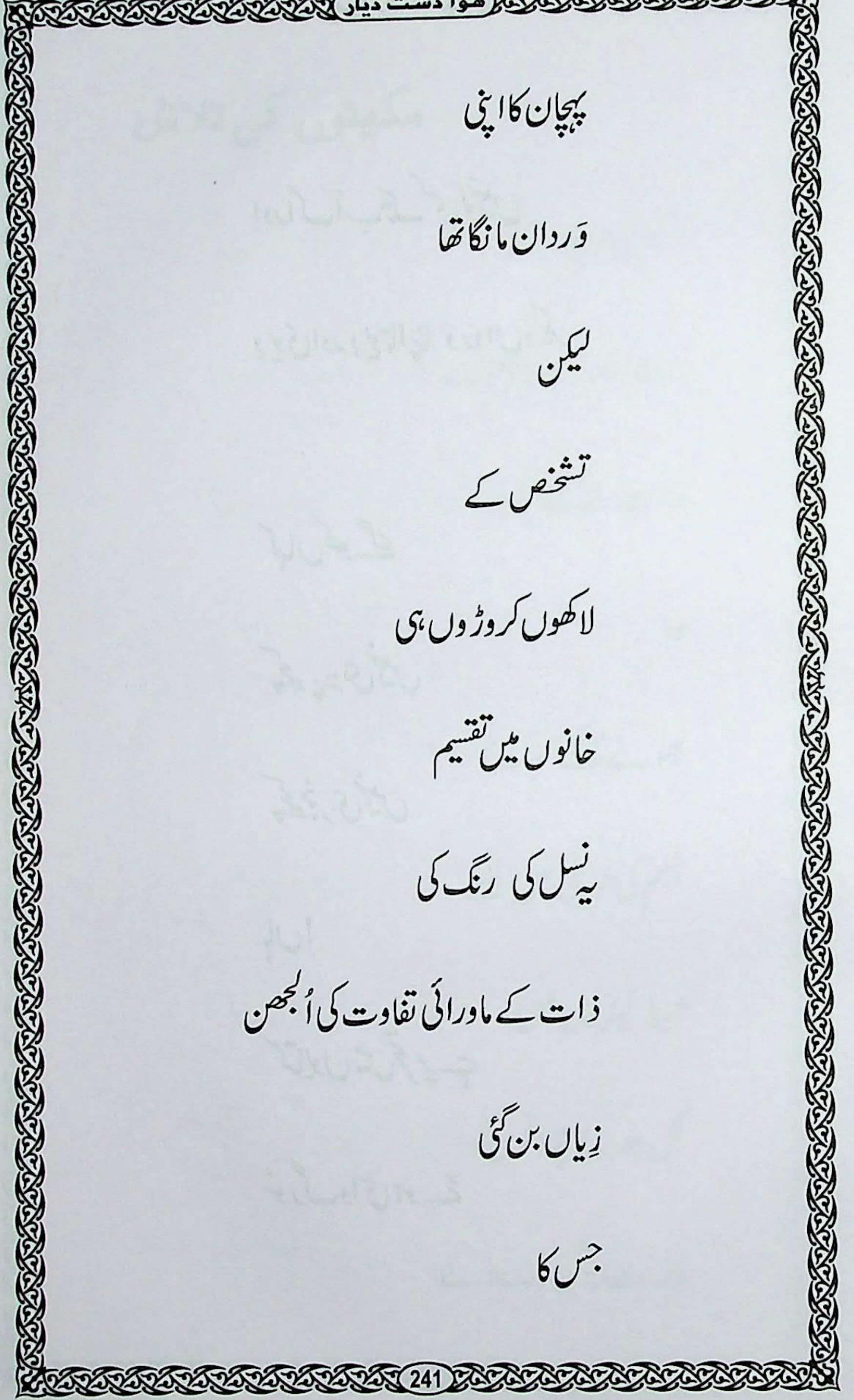
جہاں کوئی پہچان

کتنے یگوں کی دِشا

اپنی ہوکر بھی

اپنی نہیں

یہ حقیقت ہے



پہچان کا اپنی

وَردان مانگا تھا

لیکن

تشخص کے

لاکھوں کروڑوں ہی

خانوں میں تقسیم

یہ نسل کی رنگ کی

ذات کے ماورائی تفاوت کی اُلجھن

زِیاں بن گئی

جس کا

اِدراک اَب تک کسی کو نہیں

دِیوی اور دِیوتا اپنا وَرداں دیکر

کہاں کھو گئے

کچھ پتہ ہی نہیں

کچھ خبر ہی نہیں

ہاں!

کتابوں میں تحریر ہے

سُورگ واسی ہوئے

مکینوں کی تلاش

جسم کی حویلی کے

اتنے سارے دروازے

وا ہوئے تھے شاید

وہ

بھولے بھٹکے آ جائے

جسم کی حویلی میں لٹکے

شینڈ لیئروں میں

گُل ہوئے چراغوں کو

پھر سے روشنی دے دے

اِن چہل چراغوں کو زیست آشنا کر دے

یہ ہوا نہ ہونا تھا

اور سارے دروازے

زیست کے تعاقب میں

بند ہو گئے

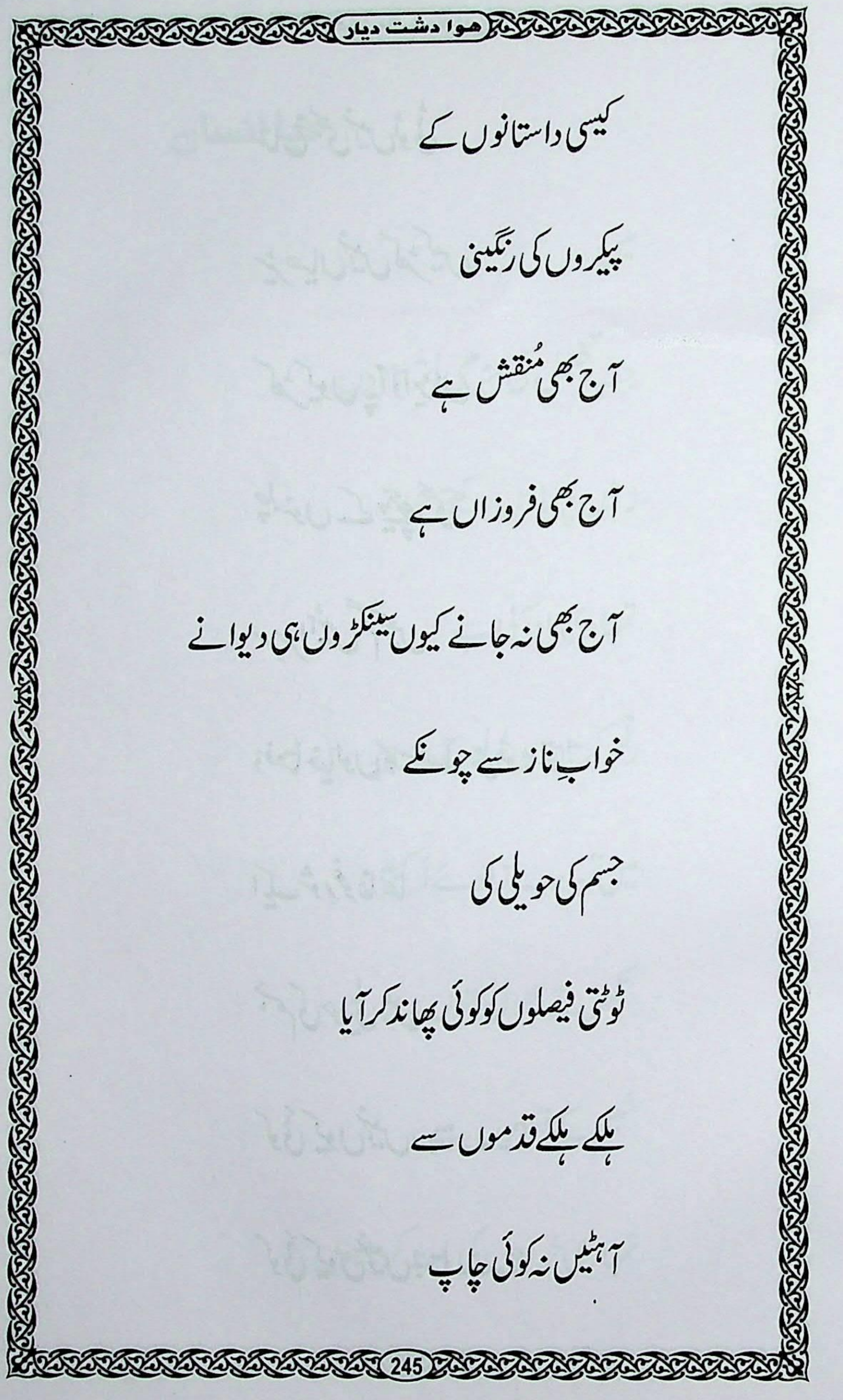
لیکن

جسم کی حویلی کی

کھڑکیوں پہ آویزاں

چلمنوں کے پیچھے سے

جلتی بجھتی آنکھوں میں



کیسی داستانوں کے

پیکروں کی رنگینی

آج بھی مُنقش ہے

آج بھی فروزاں ہے

آج بھی نہ جانے کیوں سینکڑوں ہی دیوانے

خوابِ ناز سے چونکے

جسم کی حویلی کی

ٹوٹتی فیصلوں کو کوئی پھاند کر آیا

ہلکے ہلکے قدموں سے

آہٹیں نہ کوئی چاپ

شاخ بھی نہیں ٹوٹی

سیڑھیاں نہیں کھڑکیں

کھڑکیوں پہ آوایزاں

چلمنوں کے پیچھے بھی

سرسراہٹیں گم تھیں

دَفعتاً خیالوں کا سِلسلہ ہی ٹوٹا تھا

ایک شورِ غوغا تھا.

جسم کی حویلی میں

کوئی کیوں نہیں رہتا۔۔۔؟

کوئی کیوں نہیں بستا۔۔۔؟

نیا انسان

میں

جب تخیئل کی سیڑھی اُترتا ہوں

زمیں پر پاؤں رکھتے ہی

تمہاری یاد آتی ہے

رقم کرتا ہوں ہر لوحِ بدن پر

میں تمہارے زاویئے اکثر

نکھرتے پھول پتوں پر پڑے

شبنم کے قطروں سے

تمہاری خوبیوں کی بات کرتا ہوں

میں ڈرتا ہوں

کہیں یہ بیل بوٹے ہی نہ مُرجھائیں

کہ

یہ فطری عمل کا اک تقاضا ہے

مرے

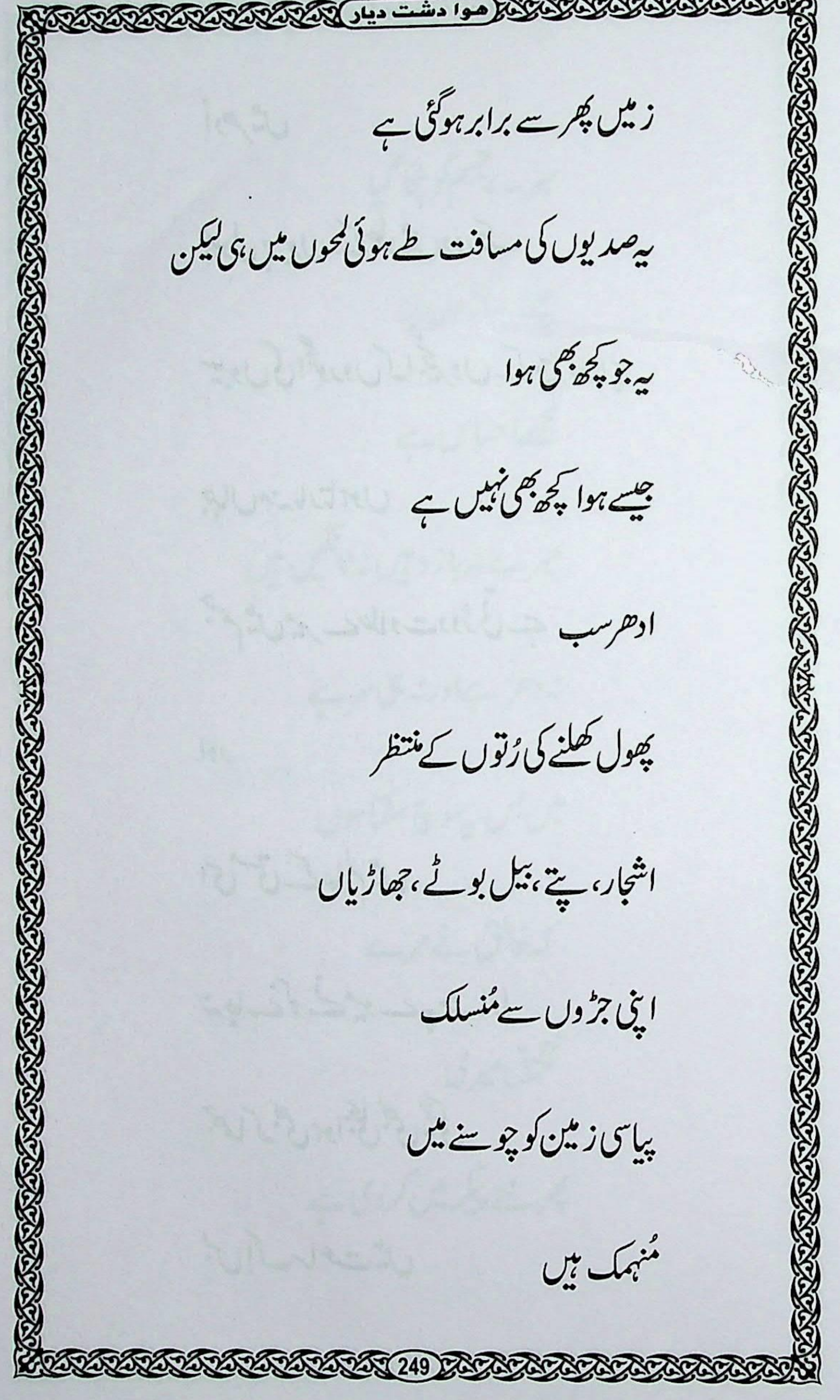
پاؤں کے نیچے کی زمیں ہلنے لگی

شق ہوگئی دھنسنے لگی ہے

میں

آہستہ روی سے اس میں دھنستا جا رہا ہوں

اچانک ہی



زمیں پھر سے برابر ہو گئی ہے

یہ صدیوں کی مسافت طے ہوئی لمحوں میں ہی لیکن

یہ جو کچھ بھی ہوا

جیسے ہوا کچھ بھی نہیں ہے

ادھر سب

پھول کھلنے کی رُتوں کے منتظر

اشجار، پتے، بیل بوٹے، جھاڑیاں

اپنی جڑوں سے مُنسلک

پیاسی زمین کو چوسنے میں

مُنہمک ہیں

اُدھر میں

پھول پریوں کے جلو میں دور تک

سیبوں کی انگوروں کہ انجیروں کے پیڑوں پر

جہاں منہ مارتا ہوں

جسم میں میرے حلاوت دوڑتی ہے

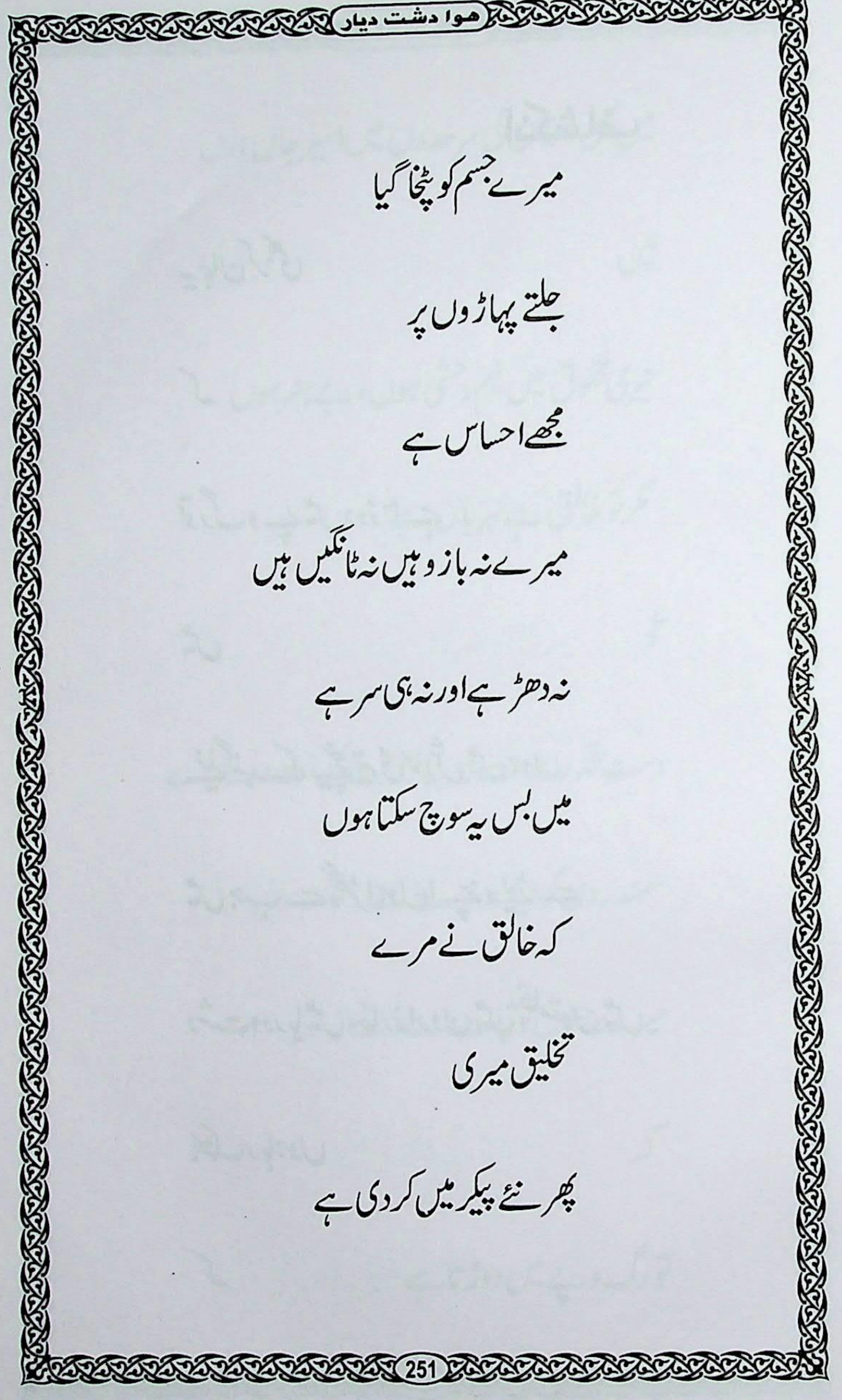
اور

اسی مستی کے عالم میں

نہ جانے کونسے میوے پہ منہ مارا

جھماکہ بھی ہوا بجلی بھی چمکی

بس اِک ساعت میں



میرے جسم کو پٹخا گیا

جلتے پہاڑوں پر

مجھے احساس ہے

میرے نہ بازو ہیں نہ ٹانگیں ہیں

نہ دھڑ ہے اور نہ ہی سر ہے

میں بس یہ سوچ سکتا ہوں

کہ خالق نے مرے

تخلیق میری

پھر نئے پیکر میں کر دی ہے

انکشاف

یہ جان کر بھی

کہ

تو رگ و پے میں دوڑتا ہے

میں

نیلے گنبد کے نیچے تیری تلاش میں ہوں

میں جب سے بچھڑا ہوں اپنے ریوڑ سے

دشت و دریا میں، خارزاروں میں، ظلمتوں میں

بھٹک رہا ہوں

کہ

میں بھی امکاں کی سرحدوں میں اسیر جاں ہوں

میں

تیری مخلوق میں نیم وحشی ہوں، بے ہنر ہوں

مگر تو خالق ہے مہرباں ہے

تُو

دست قدرت سے میری وحشت کو مات دے دے

سمندروں کو حیات دے دے

میرے جنوں کو ثبات دے دے

کہ

تو رگ و پے میں دوڑتا ہے

دائرے

کوئی

ٹوٹے ہوئے کھلونوں میں

اپنے ماضی کو قید کر آیا

کوئی

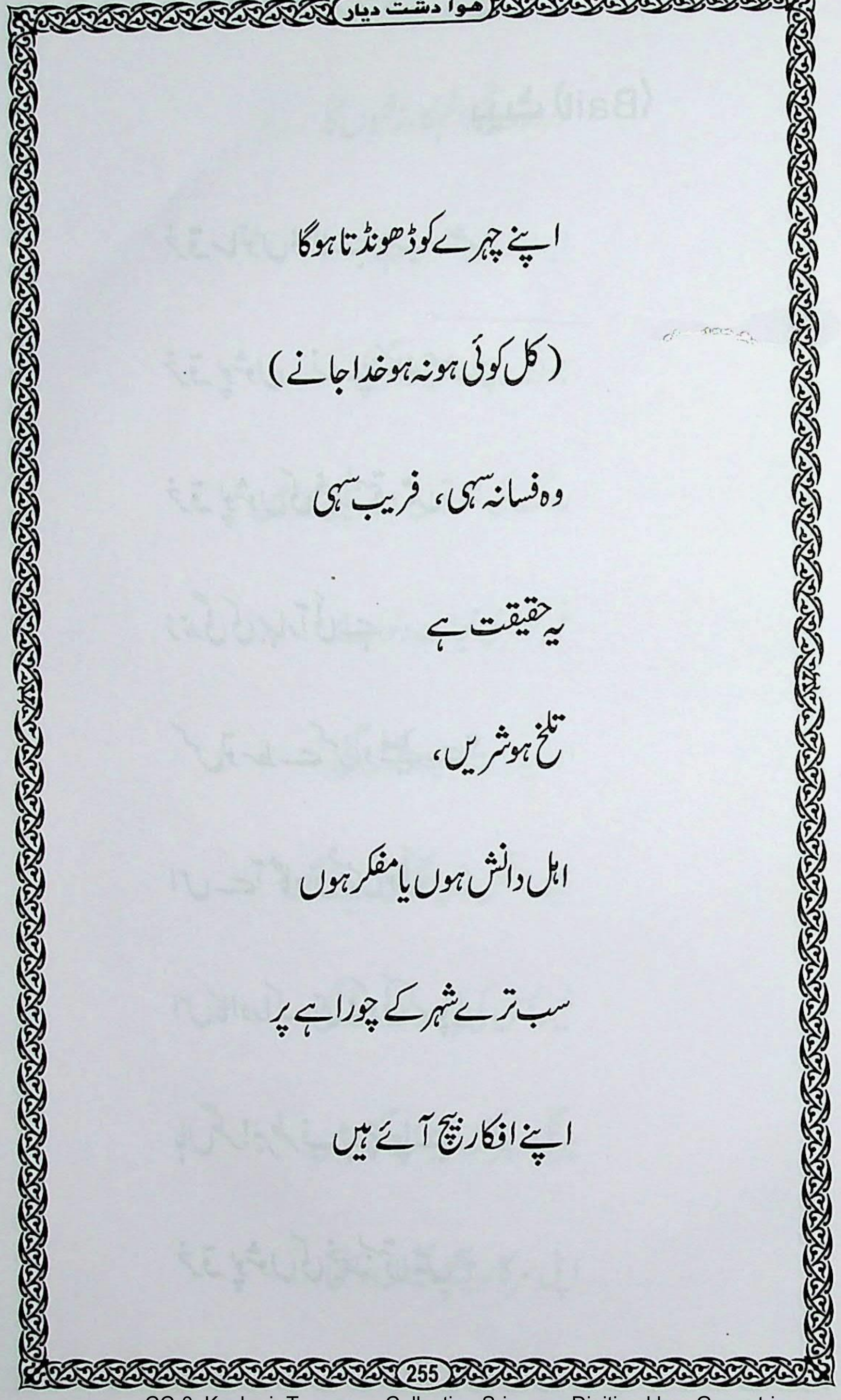
کاغذ کے پھول چُن چُن کر

حال کی خوشنما فصیلوں میں

اپنے زندہ لہو کے چھینٹوں سے

ایک عنوانِ دل تراش آیا

کوئی الجھی ہوئی لکیروں میں



اپنے چہرے کو ڈھونڈتا ہوگا

(کل کوئی ہو نہ ہو خدا جانے)

وہ فسانہ سہی، فریب سہی

یہ حقیقت ہے

تلخ ہو شریں،

اہل دانش ہوں یا مفکر ہوں

سب ترے شہر کے چوراہے پر

اپنے افکار بیچ آئے ہیں

بیٹ ‹Bait›

خرقہ سانوس ڈالا ہے جب سے

خرقہ پوشوں نے اپنے کاندھوں پر

خرقہ پوشوں کی خیمہ بستی میں

زندگی کی بہار آئی ہے

کس توسط سے کس وسیلے سے؟

اس سے آگاہ ہی نہیں کوئی

اس کا ادراک ہی نہ کوئی کر پایا

ہاں مگر! ہر طرف یہ چرچا ہے

خرقہ پوشوں کی خیمہ بستی میں

دردورنج والم کا، زخموں کا

ایسا درماں میسر ہے

جو لگائے بنا ہی روگی کو

روگ کی شدتوں سے پل بھر میں

غیر فطری نجات دلوائے

اور یہ بات ایسے پھیل گئی

جیسے جنگل میں پھیلتی ہے آگ

خیمہ بستی کی بات ہونے لگی

ہر گلی، ہر نکڑ، ہر اک گھر میں

اپنی سرکار پیچھے کیوں رہتی

اس نے تو ایک حکم نامے سے

خرقہ پوشوں کی خیمہ بستی کو

''سیر گاہِ جلیس'' دے کے قرار

داخلہ فیس بھی مقرر کی

اس سے پہلے ہی کچھ وزیر و مشیر

خیمہ بستی کی سیر کر آئے

(سلسلہ یہ ابھی بھی جاری ہے)

میڈیا نے بھی معمولاً

ان کی بریفنگ کی خوب کی تشہیر

اور ٹی وی ہو ریڈیو، اخبار

خیمہ بستی کی بات کرنے لگے

اور دنیا کے کونے کونے سے

لوگ

دیکھنے آئے ''سیر گاہِ جلیس''

اور اس طور ساری دنیا میں

خرقہ پوشوں کی خیمہ بستی کا

نامِ نامی ہوا بڑا مشہور

آج

ہر شہر، ہر محلے میں

خیمہ بستی دکھائی دیتی ہے

لوگ

درمان اپنے زخموں کا ہر گھڑی

ڈھونڈنے نکلتے ہیں

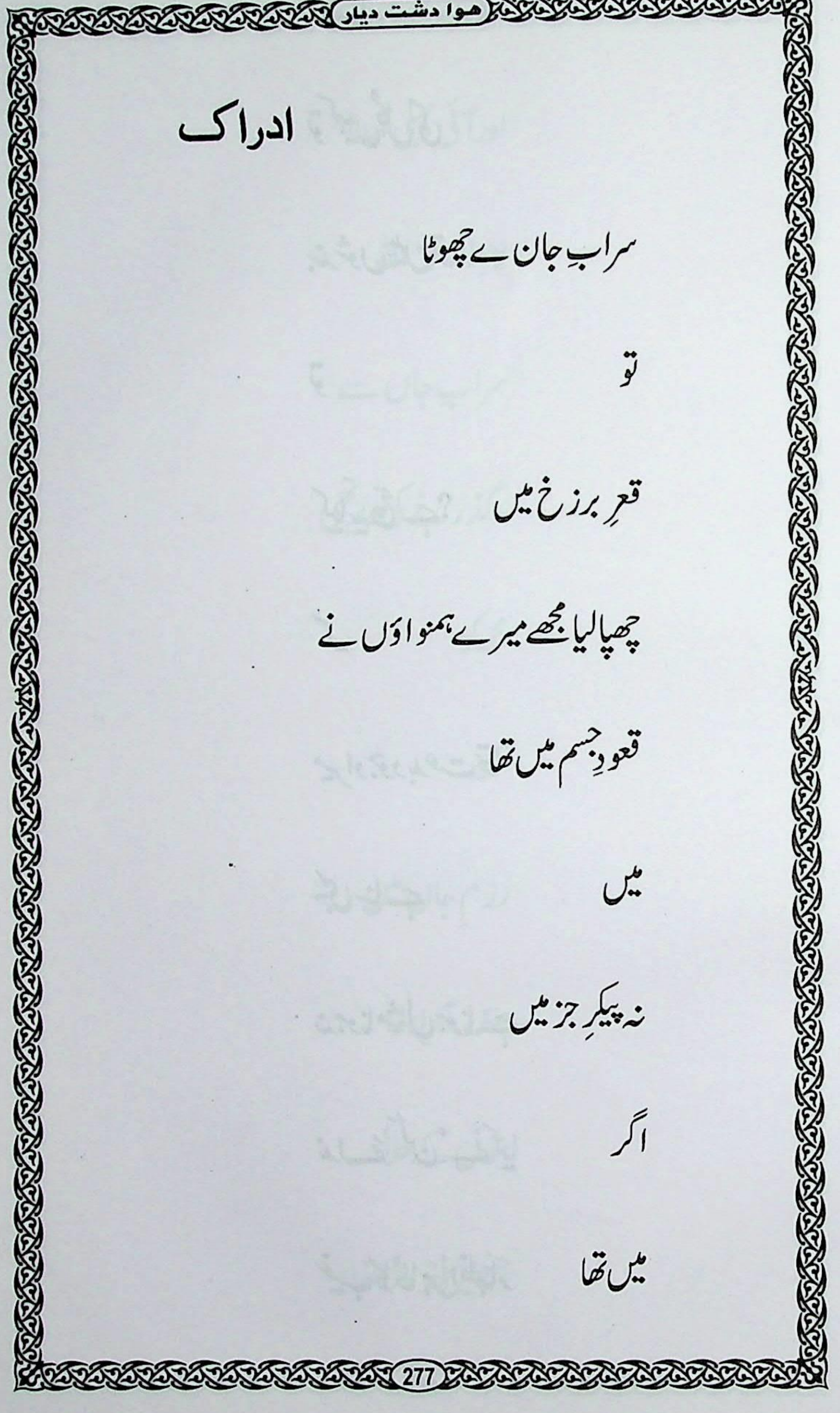
اور سب تادمِ تحریر

مجتمع کر رہے ہیں ہوش وحواس

تا کہ بارود باندھ کر سب ہی

خرقہ پوشوں کی بستیوں میں چلیں

خرقہ پوشوں کی بیٹ بن جائیں



ادراک

سرابِ جان سے چھوٹا

تو

قعرِ برزخ میں

چھپالیا مجھے میرے ہمنواؤں نے

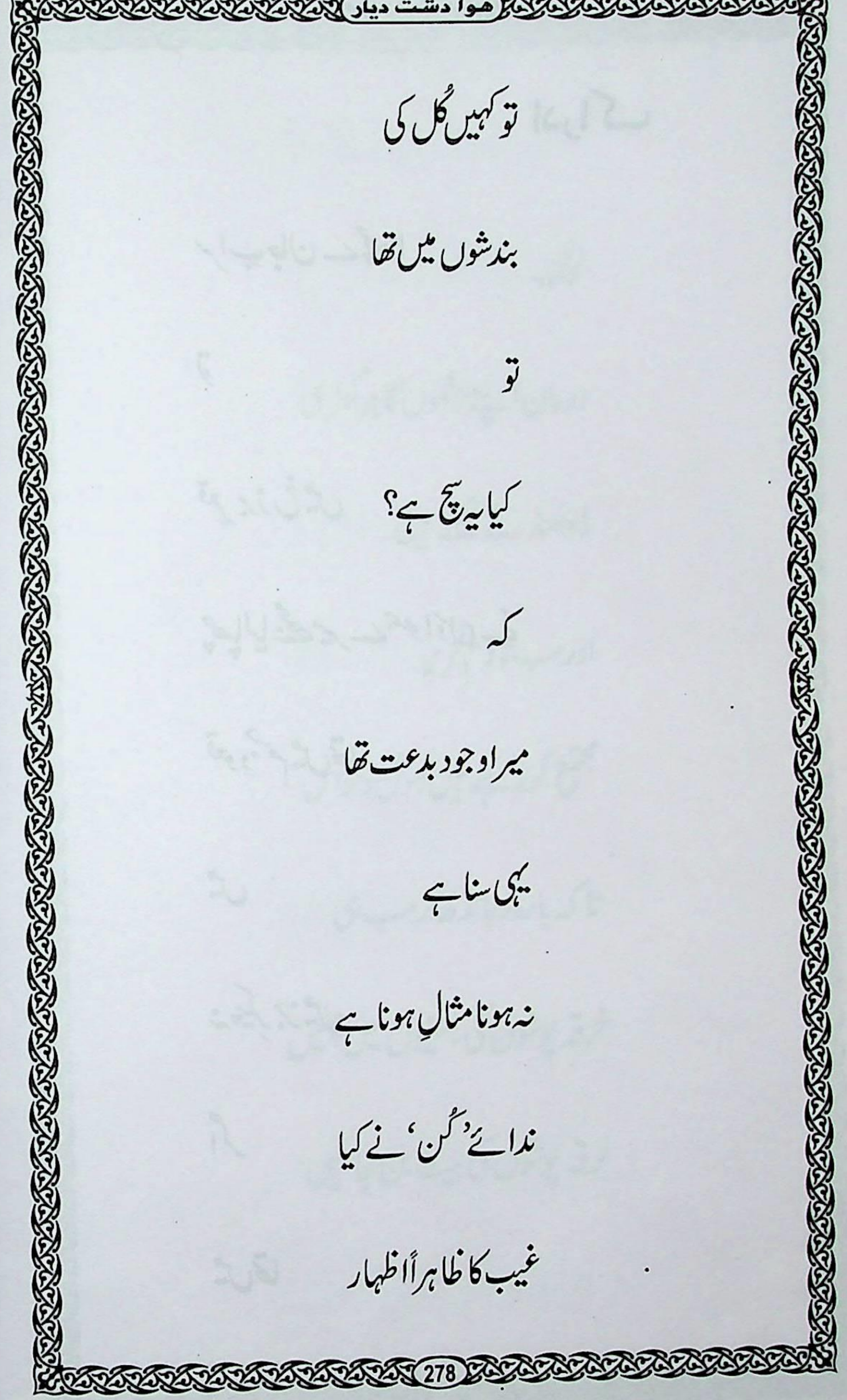
قعودِ جسم میں تھا

میں

نہ پیکرِ جز میں

اگر

میں تھا



تو کہیں گُل کی

بندشوں میں تھا

تو

کیا یہ سچ ہے؟

کہ

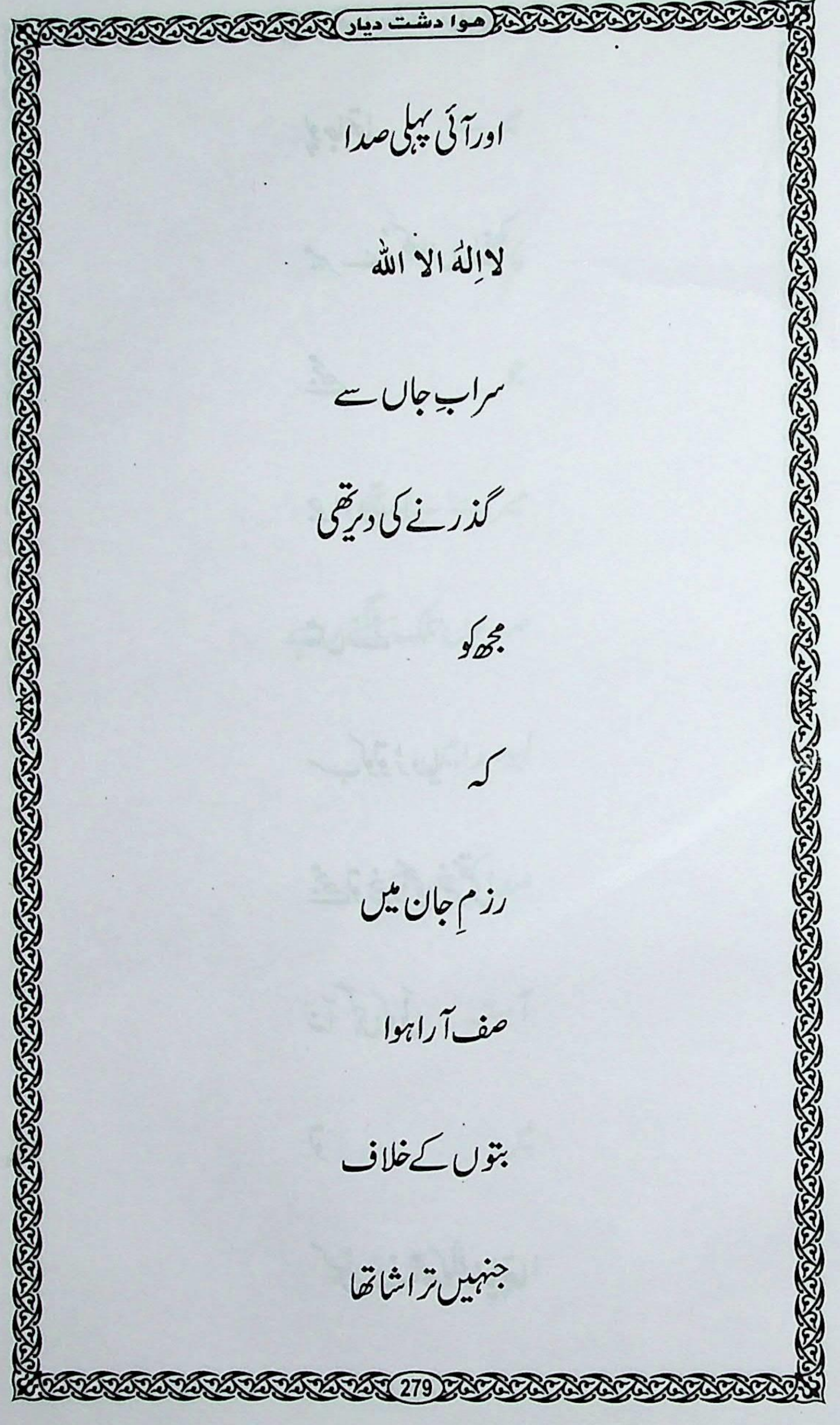
میرا وجود بدعت تھا

یہی سنا ہے

نہ ہونا مثالِ ہونا ہے

ندائے 'کُن' نے کیا

غیب کا ظاہراً اظہار



اور آئی پہلی صدا

لا اِلٰہ الا اللہ

سرابِ جاں سے

گذرنے کی دیر تھی

مجھ کو

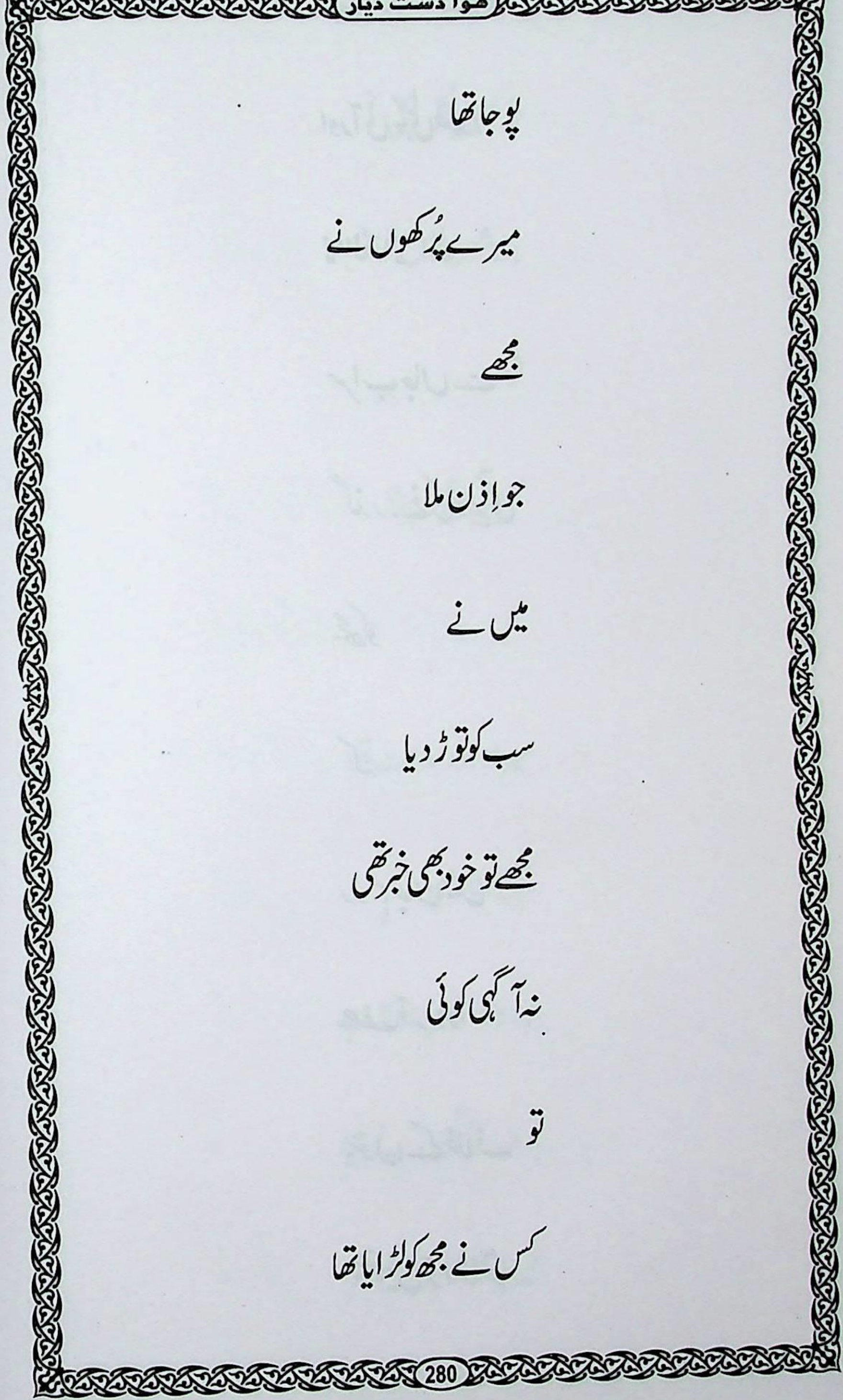
کہ

رزمِ جان میں

صف آرا ہوا

بتوں کے خلاف

جنہیں تراشا تھا



پوجا تھا

میرے پُرکھوں نے

مجھے

جو اِذن ملا

میں نے

سب کو توڑ دیا

مجھے تو خود بھی خبر تھی

نہ آگہی کوئی

تو

کس نے مجھ کو لڑایا تھا

میرے

پرکھوں سے

جو

میرے اپنے تھے

صدیوں تلک سلگتے رہے

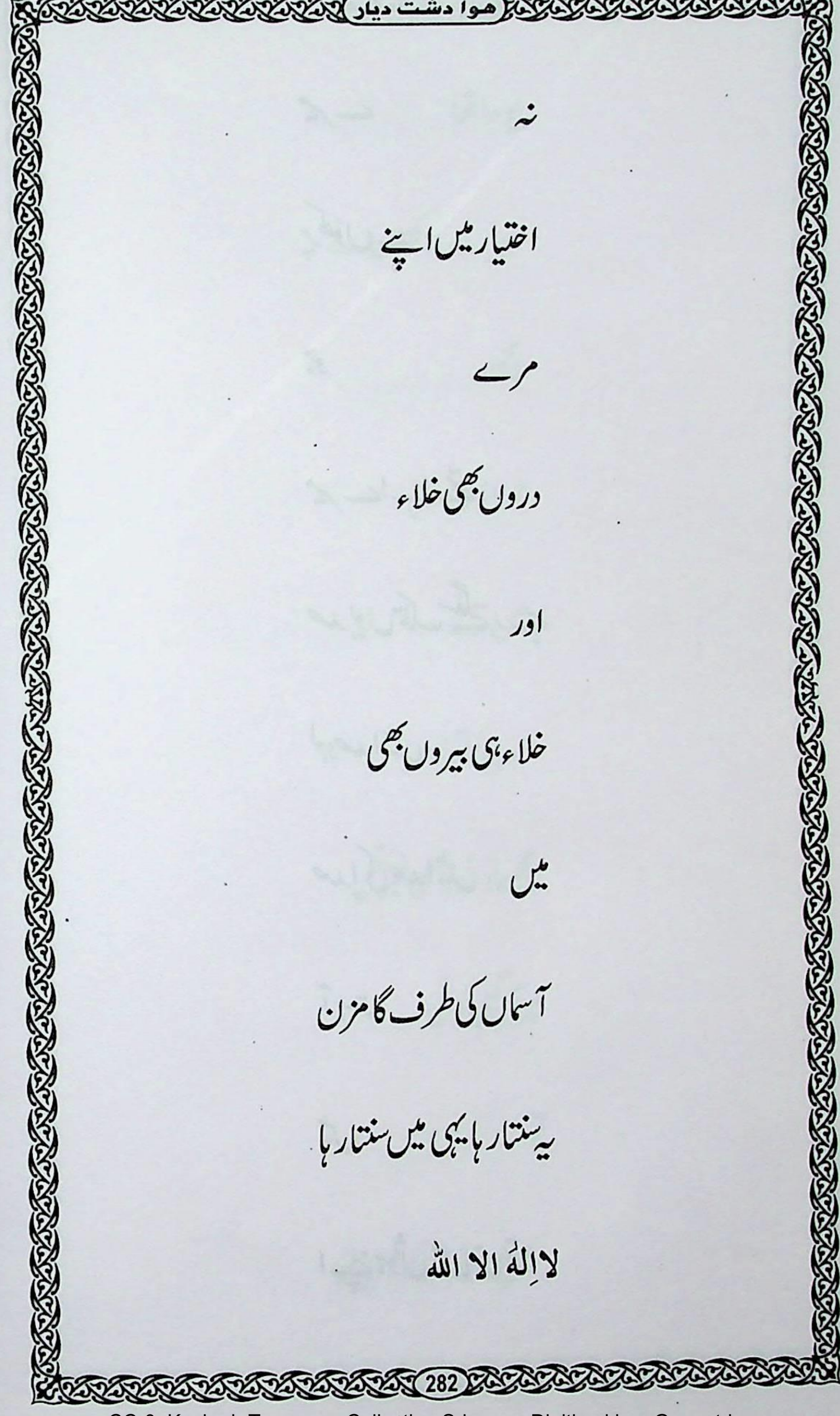
لہو صدا میں

صدا کی صدا میں

آہستہ

میں

اپنے ہوش میں ہی تھا



نہ

اختیار میں اپنے

مرے

دروں بھی خلاء

اور

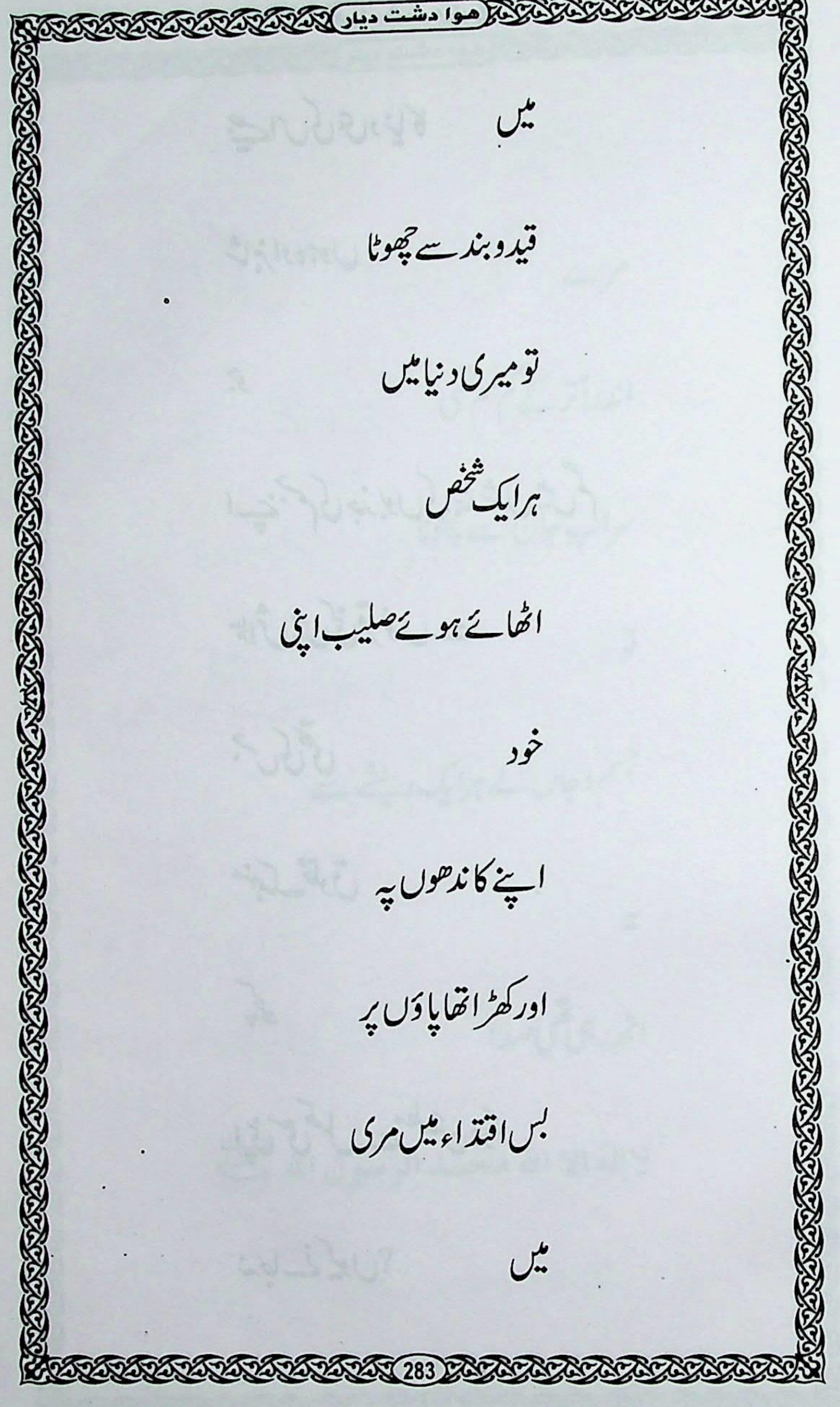
خلاء ہی بیروں بھی

میں

آسماں کی طرف گامزن

یہ سنتا رہا یہی میں سنتا رہا

لاالٰہ الا اللہ



میں

قید و بند سے چھوٹا

تو میری دنیا میں

ہر ایک شخص

اٹھائے ہوئے صلیب اپنی

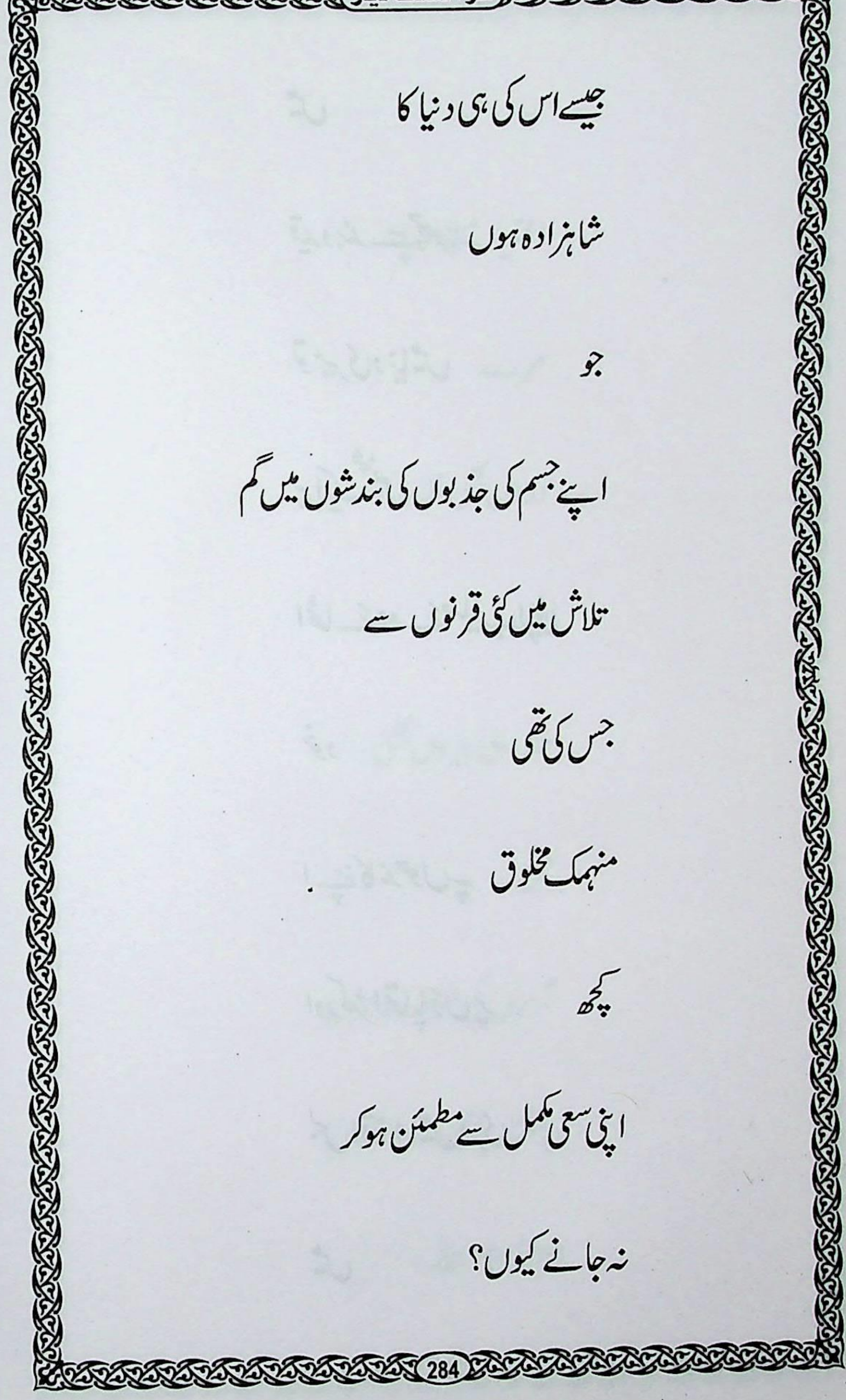
خود

اپنے کاندھوں پہ

اور کھڑا تھا پاؤں پر

بس اقتداء میں مری

میں



جیسے اس کی ہی دنیا کا

شاہزادہ ہوں

جو

اپنے جسم کی جذبوں کی بندشوں میں گم

تلاش میں کئی قرنوں سے

جس کی تھی

منہمک مخلوق

کچھ

اپنی سعی مکمل سے مطمئن ہوکر

نہ جانے کیوں؟

مرے

اندر اُتر کے گم سُم تھی

سرابِ جان سے چھوٹا

تو

جسم و جاں کے ہر ایک ریشے سے

یہ

اٹھ رہی تھی صدا

لا اِلٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ٹارگیٹ

گھونسلوں سے

پرندے نکلتے ہوئے

ہیں ہراسان تھوڑے پریشان

کچھ تذبذب بھی ہے

جانے کس نام کی گولی

کس کو لگے

گولیوں پر

کوئی نام لکھا ہی ہوتا نہیں

البتہ

ایک گولی

مرے جسم وجاں میں اتاری گئی

ہاں! مگر

بے اثر رہ گئی

میں

کہ ٹیکنالوجی کیلئے اک معمہ بنا

آج تک

جس کا حل ڈھونڈنے میں بہت کاملِ فن

شب وروز دانش

کے ابواب ترتیب دیتے ہوئے

سرخرو ہونے کی سعیٔ میں

سنا ہے

ہوئے کامیاب

میں نے

اتنا کہا تھا کہ بارود

جو

میرے اندر ہزاروں برس میں اُگی ہے

ملاوٹ سے محفوظ ہے

جب کہ

بارود جو تم نے ایجاد کی ہے

ابھی تجربوں تک ہی محفوظ و موجود و مسدود ہے

میں نے دیکھا

پرندے

مرے چار سُو غول در غول بیٹھے ہوئے

بولیاں

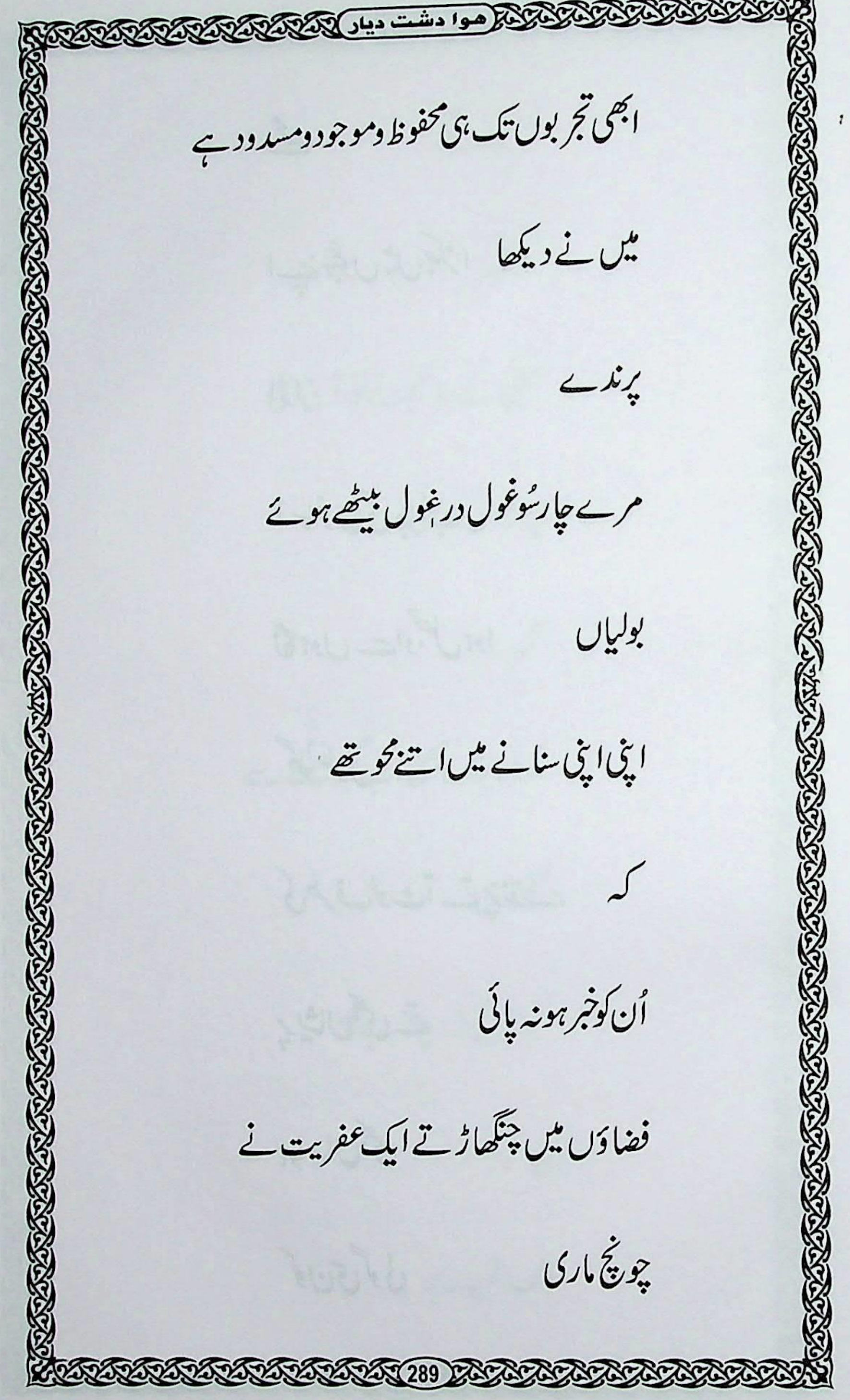
اپنی اپنی سنانے میں اتنے محو تھے

کہ

اُن کو خبر ہو نہ پائی

فضاؤں میں چنگھاڑتے ایک عفریت نے

چونچ ماری



مجھے

اپنے پنجوں میں جکڑا

اڑا

آسمانوں کی جانب

نگاہوں سے اوجھل ہوا

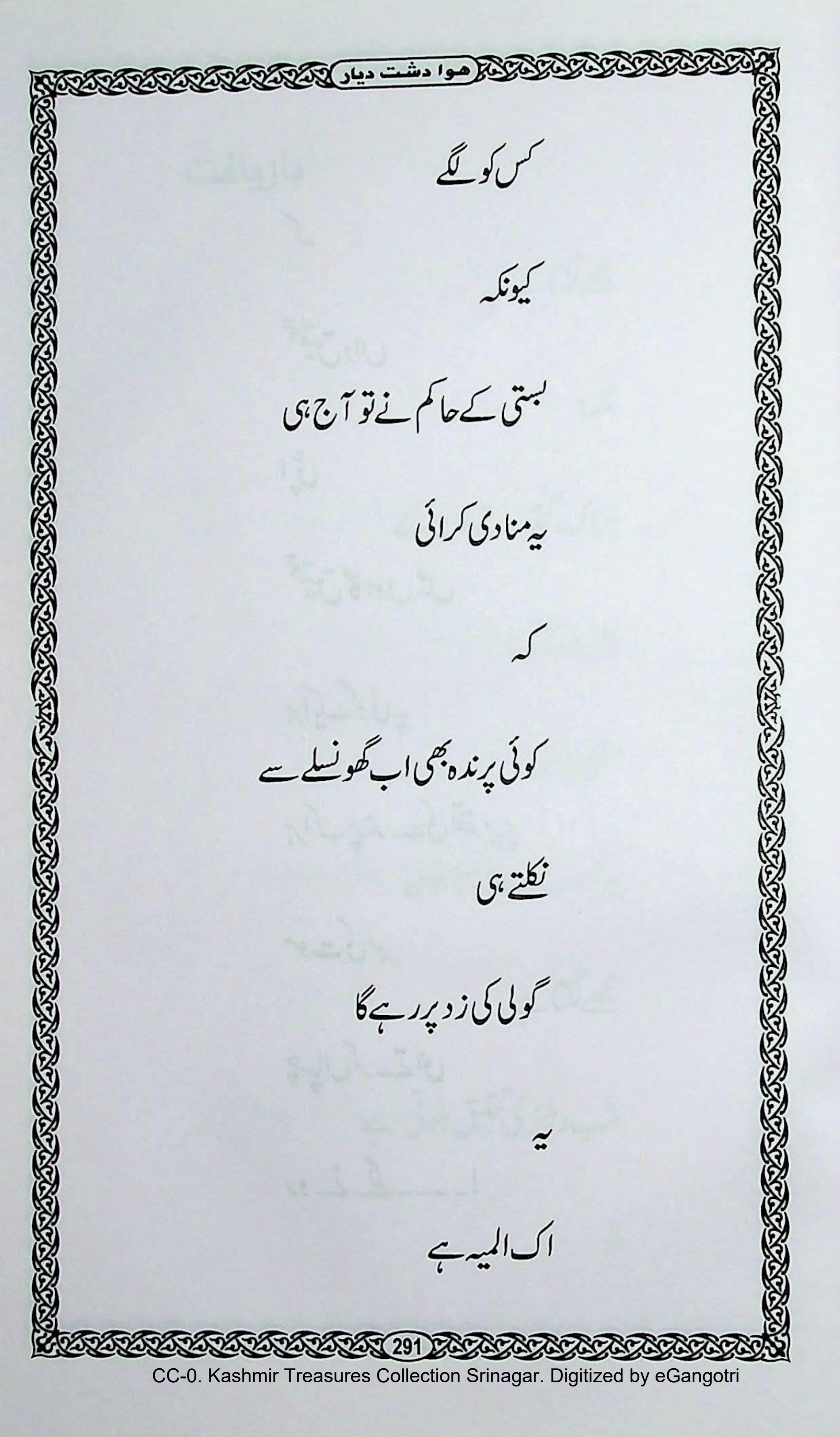
گھونسلوں

کی طرف لوٹ آتے پرندے

پریشان بھی تھے

ہراساں بھی

کون سی گولی



کس کو لگے

کیونکہ

بستی کے حاکم نے تو آج ہی

یہ منادی کرائی

کہ

کوئی پرندہ بھی اب گھونسلے سے

نکلتے ہی

گولی کی زد پر رہے گا

یہ

اک المیہ ہے

کہ

تحقیق داں

اپنی

تحقیق گاہوں میں

ہر ایک گولی پہ

ہر اک پرندے کی تقدیر پر

موت کی مہر

چسپاں کرتے ہی

رونے لگے۔۔۔۔!

بازیافت

مجھے لگتا ہے

میں

ہر اک گذرتے دن کے

جبڑوں میں

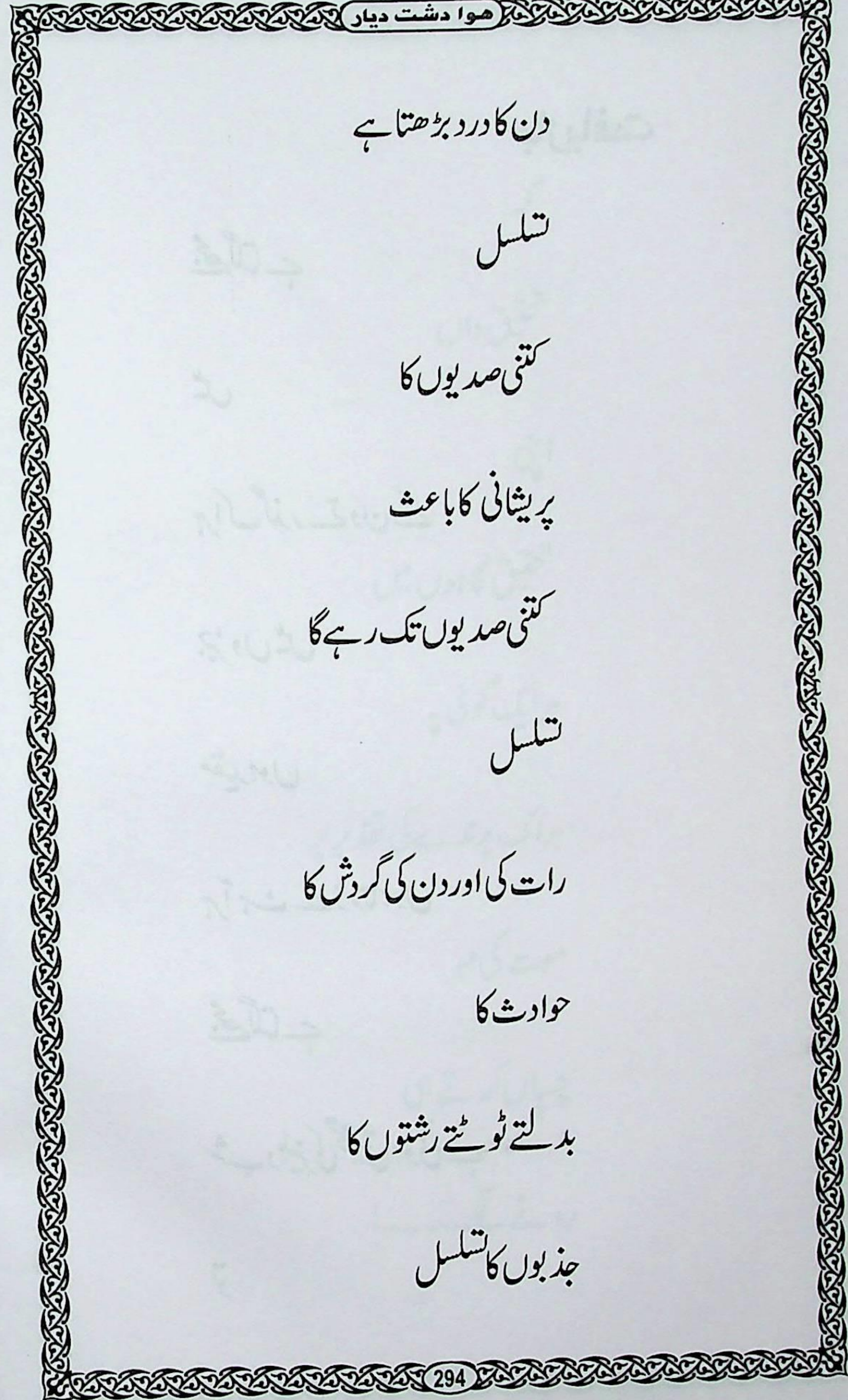
مقید ہوں

ہر آہٹ سے ڈرتا ہوں

مجھے لگتا ہے

شب دہلیز کی تخلیق ہوتی ہے

تو



دن کا درد بڑھتا ہے

تسلسل

کتنی صدیوں کا

پریشانی کا باعث

کتنی صدیوں تک رہے گا

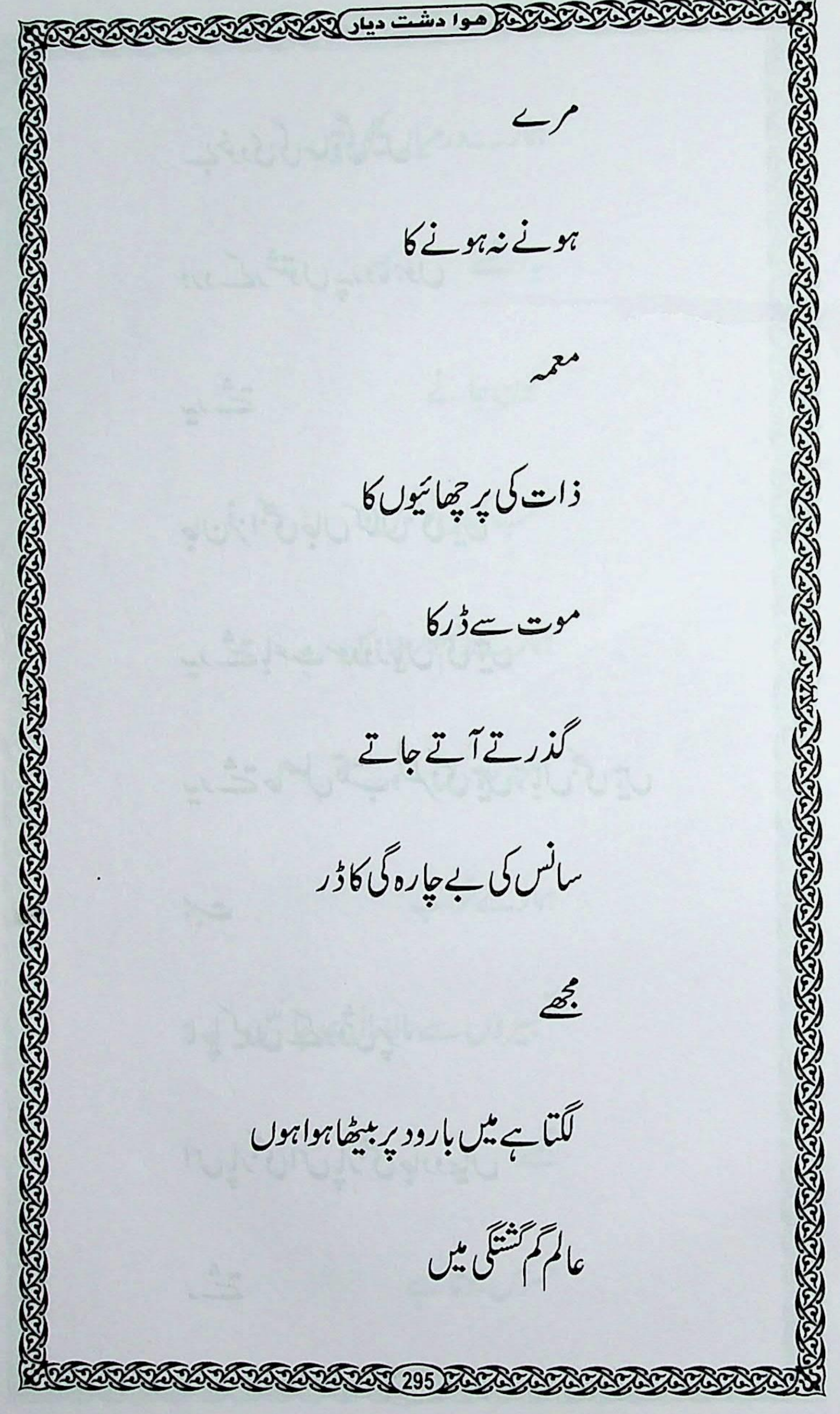
تسلسل

رات کی اور دن کی گردش کا

حوادث کا

بدلتے ٹوٹتے رشتوں کا

جذبوں کا تسلسل



مرے

ہونے نہ ہونے کا

معمہ

ذات کی پرچھائیوں کا

موت سے ڈر کا

گذرتے آتے جاتے

سانس کی بے چارہ گی کا ڈر

مجھے

لگتا ہے میں بارود پر بیٹھا ہوا ہوں

عالم گم گشتگی میں

بے خودی کی سادگی میں

درد کے رشتوں پہ روتا ہوں

یہ رشتے

جان فزا بھی جاں کناں بھی ہیں

یہ رشتے باعثِ سود و زیاں بھی ہیں

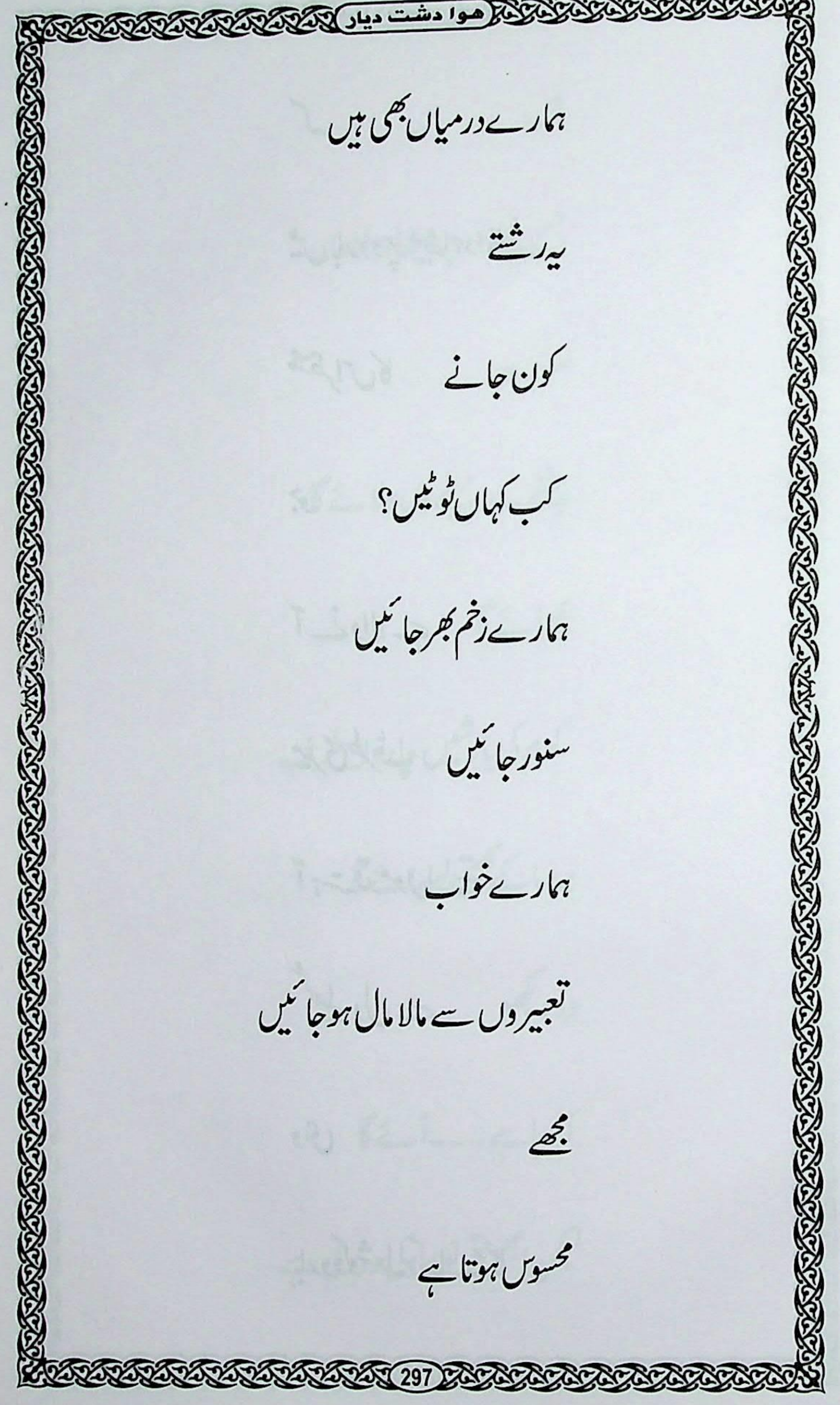
یہ رشتے حاصلِ قلب و نظر بھی ہیں زباں بھی ہیں

بہت

ناچاکیوں کے دوش پر

اس پار بھی اس پار بھی جادو بیاں

رشتے



ہمارے درمیاں بھی ہیں

یہ رشتے

کون جانے

کب کہاں ٹوٹیں؟

ہمارے زخم بھر جائیں

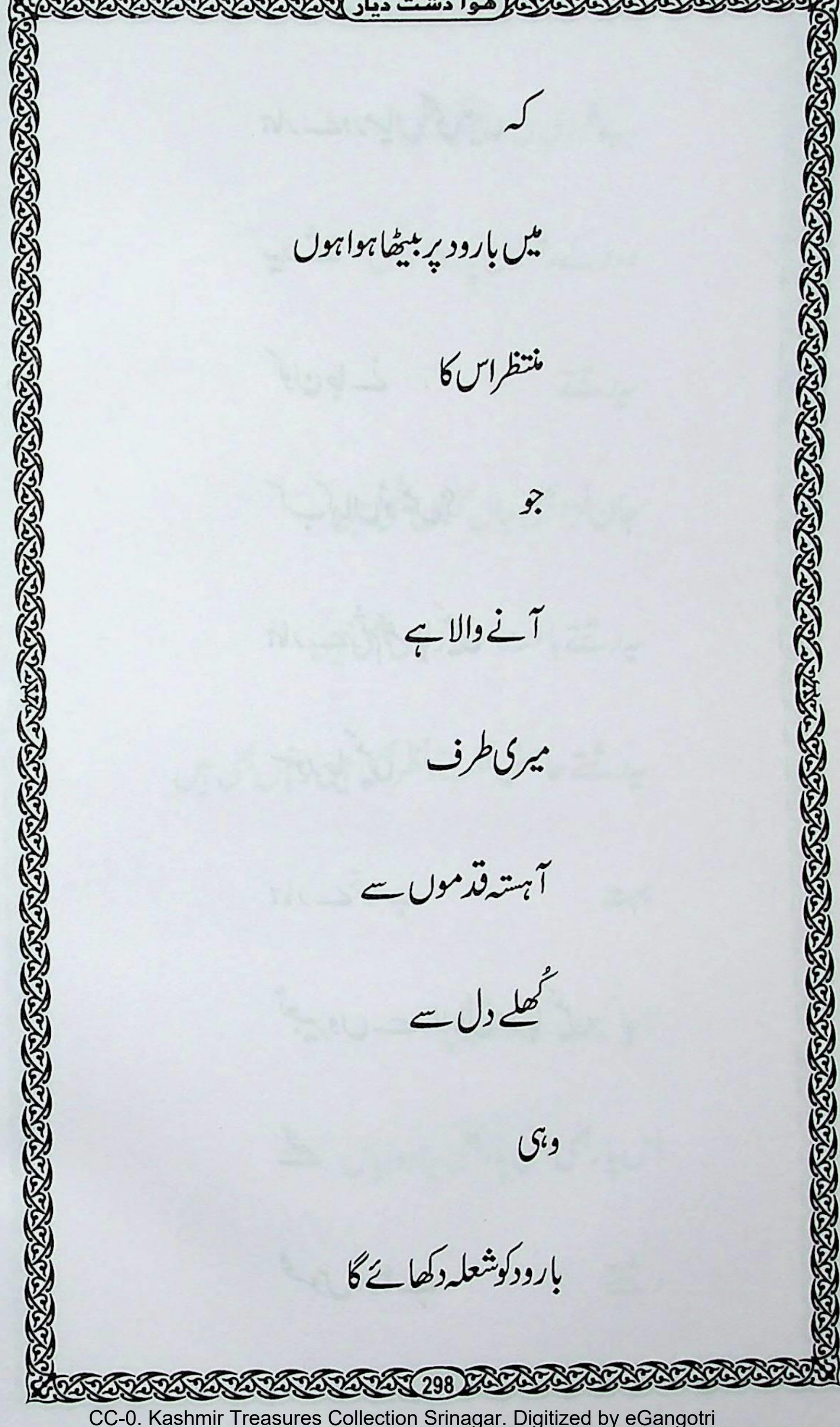
سنور جائیں

ہمارے خواب

تعبیروں سے مالا مال ہو جائیں

مجھے

محسوس ہوتا ہے



کہ

میں بارود پر بیٹھا ہوا ہوں

منتظر اس کا

جو

آنے والا ہے

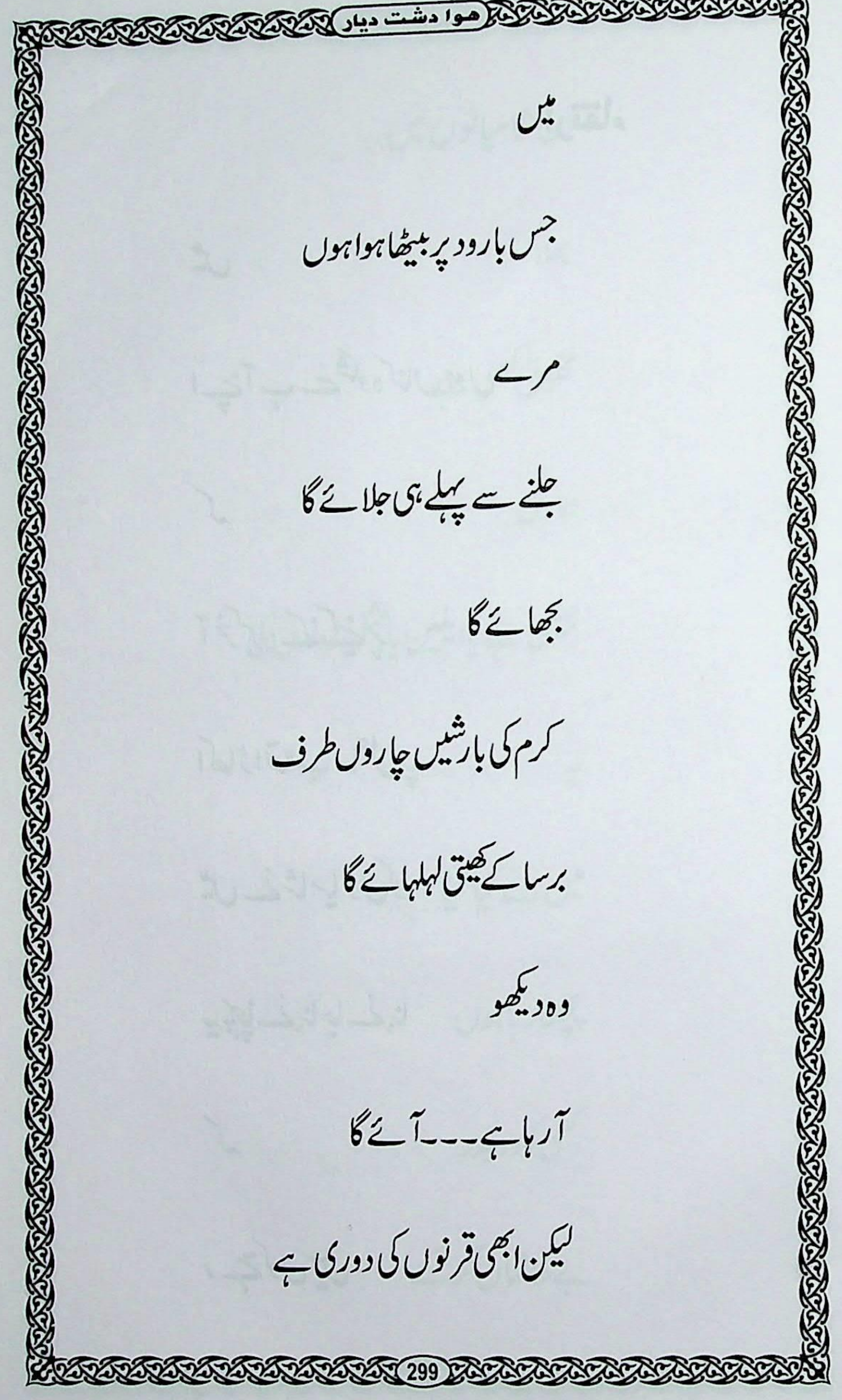
میری طرف

آہستہ قدموں سے

کُھلے دل سے

وہی

بارود کو شعلہ دکھائے گا



میں

جس بارود پر بیٹھا ہوا ہوں

مرے

جلنے سے پہلے ہی جلائے گا

بجھائے گا

کرم کی بارشیں چاروں طرف

برسا کے کھیتی لہلہائے گا

وہ دیکھو

آ رہا ہے۔۔۔آئے گا

لیکن ابھی قرنوں کی دوری ہے

ارتقاء

میں

اپنے آپ سے شکوہ کناں ہوں

کہ

آخر کس کے کہنے پر

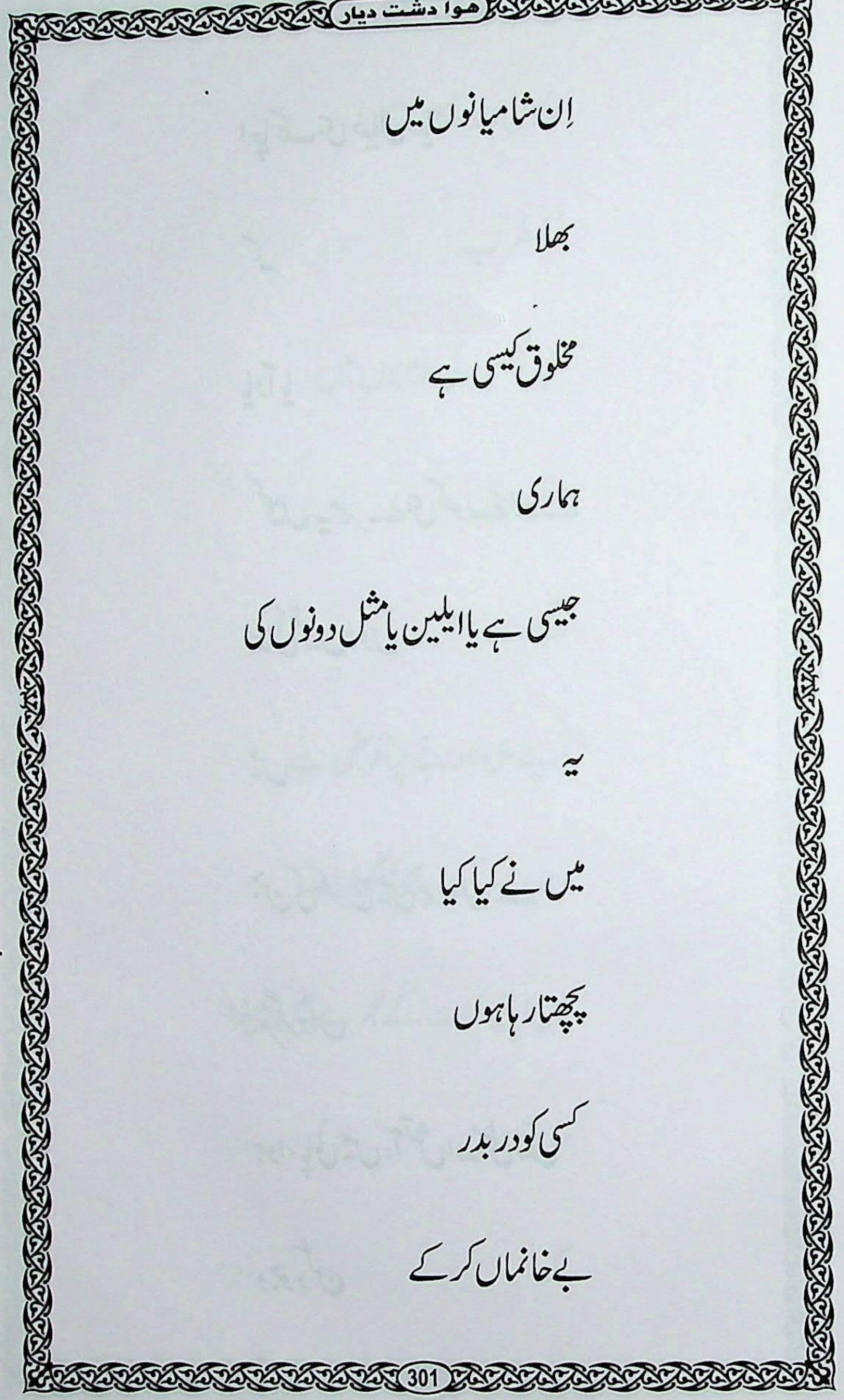
اکھاڑا تھا لبِ ساحل پہ

میں نے شامیانوں کو

یہ پہچانے بِنا جانے بِنا

کہ

رہتے کون ہیں



اِن شامیانوں میں

بھلا

مخلوق کیسی ہے

ہماری

جیسی ہے یا ایلین یا مثل دونوں کی

یہ

میں نے کیا کیا

پچھتا رہا ہوں

کسی کو در بدر

بے خانماں کر کے

اچانک ہی خیال آیا

کہ

یاد آیا

کہیں یہ میرے ہی کھوئے ہوئے

بھائی نہیں ہوں

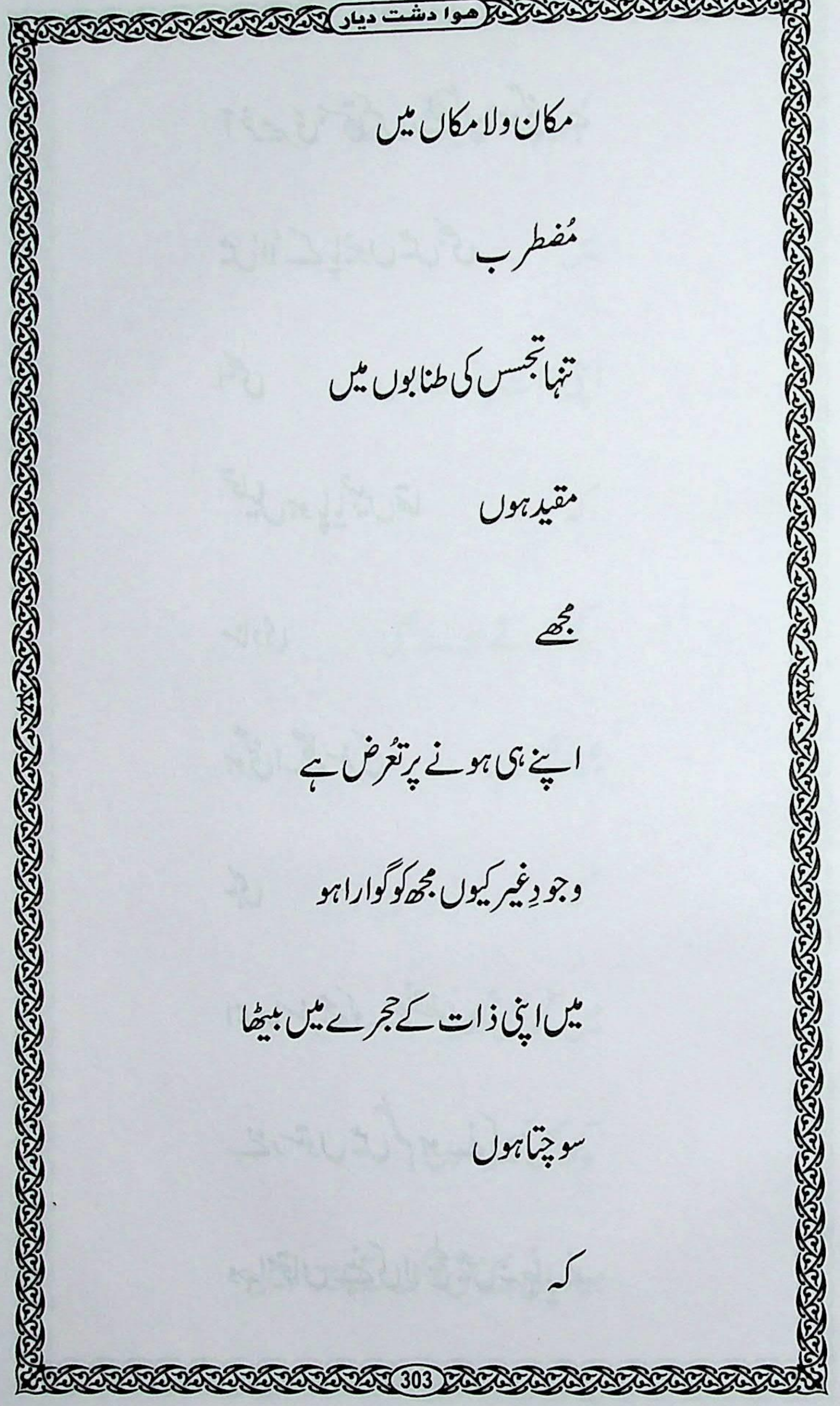
میں

جن کی کھوج میں برسوں سے

سرگرداں

ہوا، پانی میں، آتش اور مٹی میں

وجودِ کُن



مکان ولامکاں میں

مُضطرب

تنہا تجسس کی طنابوں میں

مقید ہوں

مجھے

اپنے ہی ہونے پر تعُرض ہے

وجودِ غیر کیوں مجھ کو گوارا ہو

میں اپنی ذات کے حجرے میں بیٹھا

سوچتا ہوں

کہ

آخر میری ہستی کس لئے کُن ہوگئی ہے

میں 'لا' کے پانیوں میں بھی

ابھی

تحلیل ہو پایا نہیں تھا

منادی

ہوگئی اگلے سفر کی

یہی

اندھا سفر مجھ کو نئے نقطوں

نئے رستوں میں گُم ہونے کی

وجہ امتحاں بننے کی لالچ میں نہ جانے

کس پہاڑی پر پٹخ دے گا

میں

اپنی ذات پر نوحہ کناں

کہ

کچھ ہوتے ہوئے بھی

مجھ کو لگتا ہے

کہ

میں کچھ بھی نہیں

کچھ بھی نہیں ہوں

ہوا، پانی کے مٹی آگ کے اجزاء میں

گوندھا جا چکا ہوں

مرا

اس میں کوئی حصہ نہیں ہے

میں

اپنے آپ سے شکوہ کناں

شکوہ کناں ہوں

کنفیشن

مجھ کو

ڈر لگتا نہیں پرچھائیوں سے

میں اپنے نظم میں ہوں

کہیں سے بھی شکست وریخت دکھلائی نہیں دیتی

وجودِ خاک میں میرے

شکست وریخت

جس کی ابتداء ہی

ذات کے اندر سے ہوتی ہے

ہزاروں، لاکھوں ٹکڑوں میں

ہوئی تقسیم جس کی

مرے

اندر بھی باہر بھی

مگر

کوئی اس سے تو آشنا ہو ہی نہیں پایا

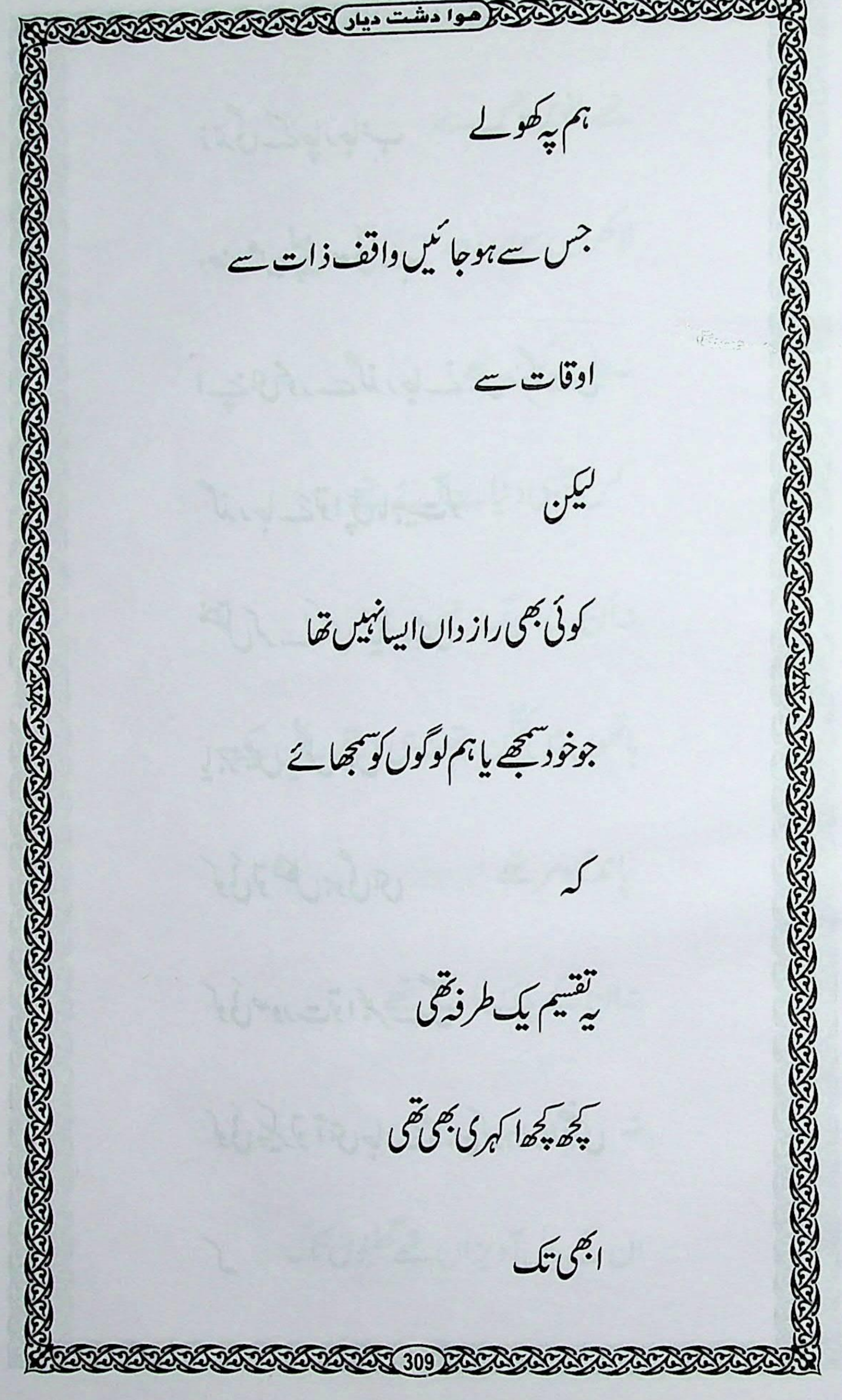
کوئی اس راز سے واقف نہیں ہے

مگر

ہر شخص متلاشی تھا کوئی تو ملے

جو

بھید ایسا



ہم پہ کھولے

جس سے ہو جائیں واقف ذات سے

اوقات سے

لیکن

کوئی بھی راز داں ایسا نہیں تھا

جو خود سمجھے یا ہم لوگوں کو سمجھائے

کہ

یہ تقسیم یک طرفہ تھی

کچھ کچھا کھری بھی تھی

ابھی تک

زندگی کے چار جانب

دھند میں لپٹی ہوئی ہے

اپنے ہی محور سے گذر جانے میں سرگرداں

گذر جائے تو اپنی ماہیت کو

منتقل کر لے کسی سیال میں

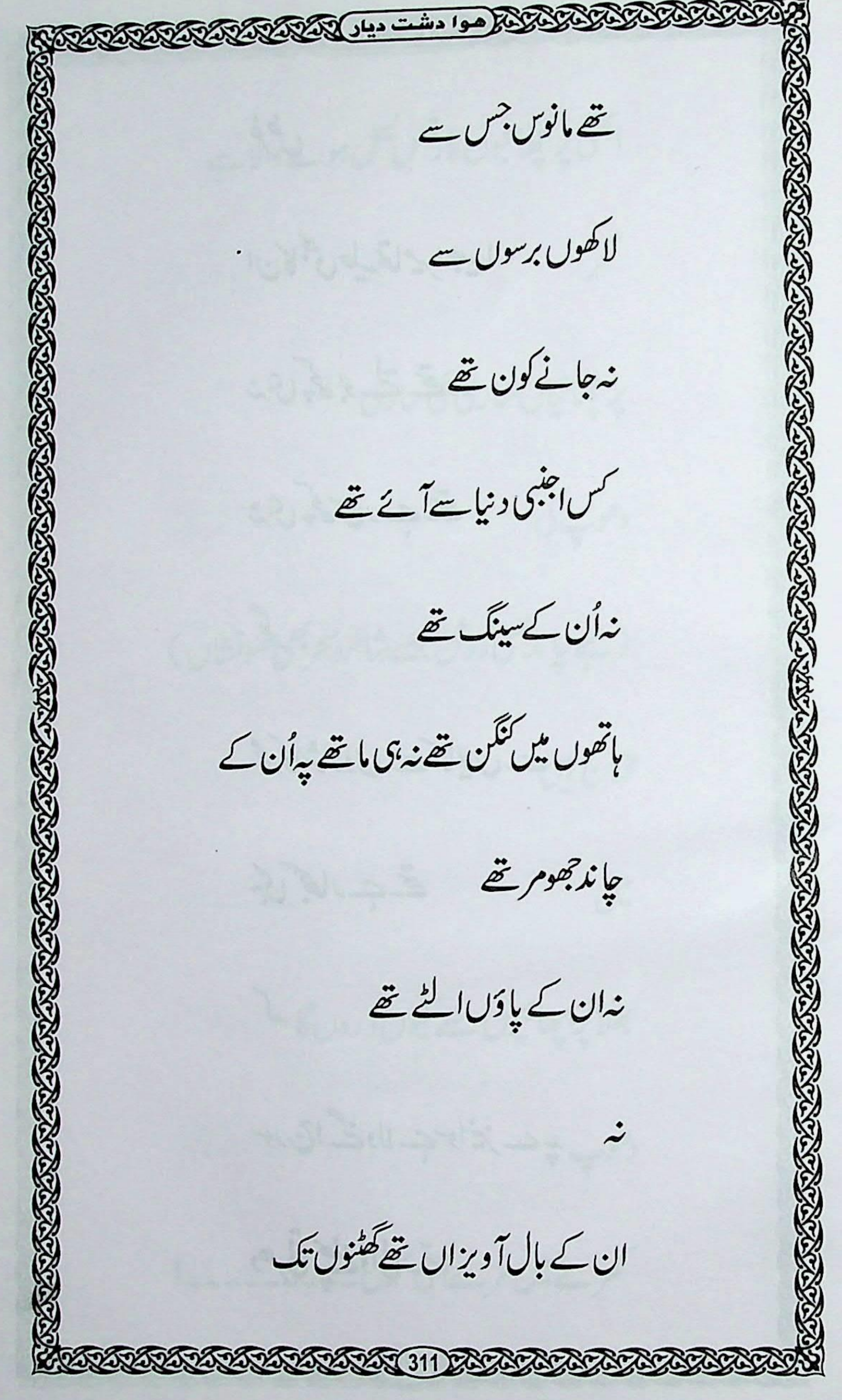
یا جز میں یا کُل میں

کوئی تو شکل ہو گی ہی

کوئی صورت تو ابھرے گی

کوئی پیکر تو آ ہی جائے گا بن کر ہمارا اجنبی

کہ



تھے مانوس جس سے

لاکھوں برسوں سے

نہ جانے کون تھے

کس اجنبی دنیا سے آئے تھے

نہ اُن کے سینگ تھے

ہاتھوں میں کنگن تھے نہ ہی ماتھے پہ اُن کے

چاند جھومر تھے

نہ ان کے پاؤں الٹے تھے

نہ

ان کے بال آویزاں تھے گھٹنوں تک

غرض

ان کا بھی حلیہ تھا میرا جیسا

نہ ہی کچھ بولتے تھے وہ

نہ ہی کچھ سن رہے تھے

مگر

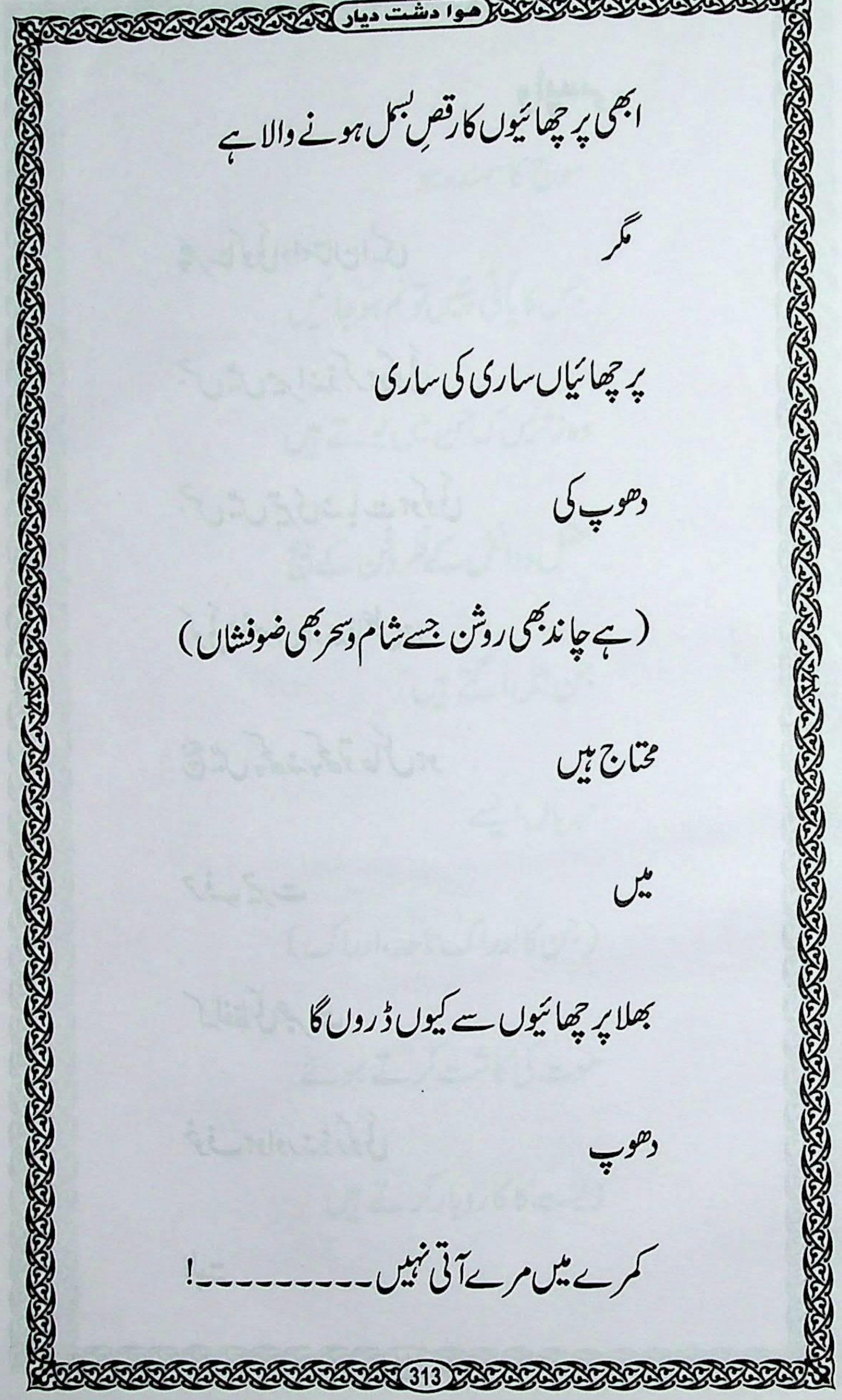
مجھ کو اشاروں سے کنایوں سے

یہی سمجھا رہے تھے

کہ

سورج اگنے والا ہے سوا نیزے پہ

دھرتی پھٹنے والی ہے



ابھی پرچھائیوں کا رقصِ بسمل ہونے والا ہے

مگر

پرچھائیاں ساری کی ساری

دھوپ کی

(ہے چاند بھی روشن جسے شام و سحر بھی ضوفشاں)

محتاج ہیں

میں

بھلا پرچھائیوں سے کیوں ڈروں گا

دھوپ

کمرے میں مرے آتی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

واپسی

پھر سنا کوئی داستان ایسی

جس میں میرا نہ ذکر ہو کوئی

جس میں تیری نہ بات ہو کوئی

کوئی مفعول ہو نہ فاعل ہو

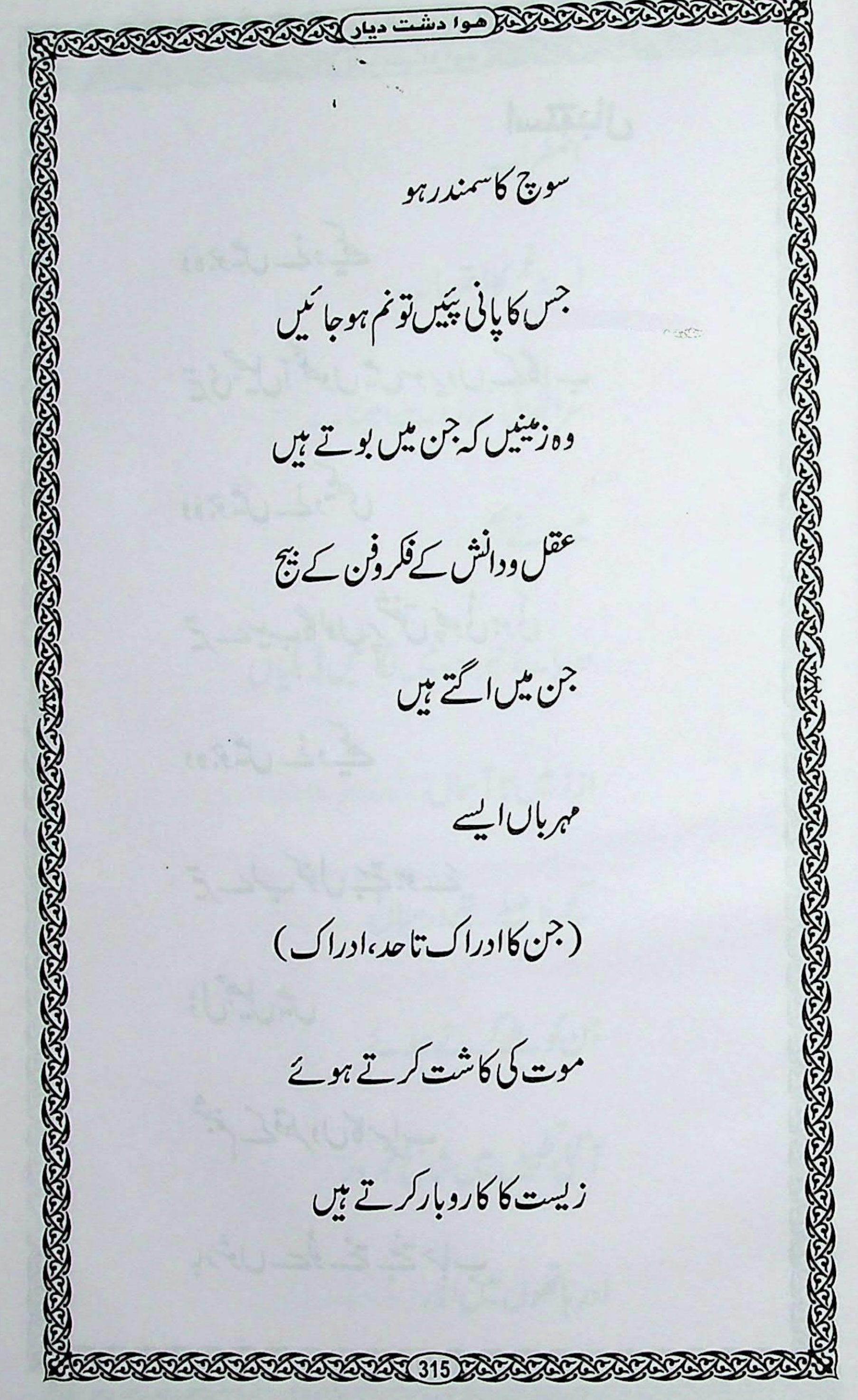
بیچ میں کچھ نہ کچھ تو حائل ہو

حرفِ حیرت

کہ لفظ کی عبرت

خوف ہو اور نہ ڈر کوئی

البتہ



سوچ کا سمندر رہو

جس کا پانی پیئیں تو نم ہو جائیں

وہ زمینیں کہ جن میں بوتے ہیں

عقل و دانش کے فکر و فن کے بیج

جن میں اگتے ہیں

مہرباں ایسے

(جن کا ادراک تا حد، ادراک)

موت کی کاشت کرتے ہوئے

زیست کا کاروبار کرتے ہیں

استقبال

وہ جو میں نے دیکھے

تیری جھیل آنکھوں میں سویروں کے گلاب

وہ جو میں نے دیکھی

تیرے سیب گالوں پر شفق پھوٹی ہوئی

وہ جو میں نے دیکھے

تیرے لب کنول بہتے ہوئے

ڈل جھیل میں

شبنم کے قطروں کا سراب

بارشوں سے ٹوٹتے بنتے حباب

اضطراب

اپنے غم کا احتساب

سر اٹھاتی آرزو سے اجتناب

میں نے بھی

دریائے حیرت میں لگائیں ڈبکیاں

از زمیں تا آسماں

کچھ فاصلے تھے درمیاں

جن کو طے کرتے ہوئے

آ گئی تخیل میں شاخِ ثمرور

اور ہاتھوں میں انار

یاد مجھ کو بھی مقولہ آ گیا

یک انار بیمار صد

پاٹتے رہتے ہیں حد

ادراک کی

افکار کی سرحد

جسم قدرے منجمد

قدرے رواں

گیلی لکڑی کا دھواں

ہر دشا میں بے جہت بے خانماں

میں نے سمیٹیں دوریاں مجبوریاں

ہرزہ سرا

ہراور تھے پھیلے

اُتر دکھشن میں پورپ اور پچھّم میں

بجاتے بین اپنی

گیت گاتے

لےتھی جن کی اک تباہی اور فساد

اور میں ہوں غوطہ زن

اک عالمِ حیرت میں

عبرت میں

کس کی سنوں

کس سمت جاؤں

کون میرے درد کا درماں بنے

اچانک

جھیل آنکھوں کے گلاب

سیب گالوں پر شفق پھوٹی ہوئی

ڈل کے پانی پر نہاتے لب کنول

شبنم کے قطروں کا سراب

بارشوں سے ٹوٹتے بنتے حباب

میری اگوائی کو آئے تھے یہاں



مظفر ایرج ایک ایسے شاعر ہیں جو کائناتی مسائل اور سماجی درد وکرب کو اپنی دلی کیفیات او[illegible]

ڈھال کر اپنے شعری پیکروں میں جان ڈال دیتے ہیں چونکہ ان کے اسلوب پر ان کی [illegible]

شاعری میں روح عصر بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے اس لئے بحثیت عصر حاضر کے [illegible]

میں اپنی جگہ آپ بنا چکے ہیں۔ وہ ہر دم Concious رہتے ہیں اس لئے ان کی زبان سادہ اور سلیس [illegible]

چھوٹی بحروں میں اپنی جولانیاں دکھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے وہ اوسط درجے کی بحروں میں بھی طبع آزمائی کر[illegible]

ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں ہمارے معاشرے کے حالات ورجحانات اور ان کی داخلی دنیا کے منظر اپنی بھر[illegible]

جمالیات کے ساتھ اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ سادہ لفظوں میں بھی اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے ہیں اور ج[illegible]

موضوع متقاضی ہوتا ہے تو استعارات وعلامات کو بھی اپنی شعری زبان بنا لیتے ہیں۔ اور یہی رویہ ثابت کرتا ہے کہ

مظفر ایرج نے ہمہ گیر موضوعات کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا ہے۔

علی گڑھ رئیس الدین رئیس